۲۲
مختصر کہانیاں

۲۲

مختصر کہانیا

نقاشی : ٹپس گہا

مترجم: محمد آصف جاہ

چلڈرن بک ٹرسٹ ☆ قومی کونسل برائے فروغ اردو

ے

بان ☆ بچوں کا ادبی ٹرسٹ

۲۲

مختصر کہانیاں

نقاشی : تپس گہا

مترجم: محمد آصف جاہ

چلڈرن بک ٹرسٹ ☆ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ☆ بچوں کا ادبی ٹرسٹ

فہرست

ہمارے پڑوسی

دیویکا رنگاچاری

روی اور میں بے سبب ہی کھڑکی سے جھانک رہے تھے کہ اچانک ہمارے پڑوس والے گھر کے سامنے ایک ٹرک آکر رُکا۔

"شاید کوئی اِس گھر میں آرہا ہے" میں بڑبڑایا "اب ہم کیا کریں گے؟"۔

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اِس گھر کا باغیچہ پچھلے ایک ماہ سے ہمارے کھیلنے کا میدان بنا ہوا تھا۔ ہم نے خزانوں کی تلاش میں وہاں کتنے ہی گھنٹے گذارے تھے اور کتنی ہی مرتبہ آنکھ مچولی کا کھیل کھیلا تھا۔ اکثر ہم لوگ کھڑکیوں کے شیشے سے اندر جھانکتے اور اندر سے اس مکان کو دیکھتے۔

"اندر ایک بھوت ہے" روی کہتا۔ "میں اُسے محسوس کر رہا ہوں"۔

میں ڈر سے تھر تھرانے لگتا اور خود کو محفوظ رکھنے کے لیے فوراً دعا مانگنے لگتا۔ اور اب کبھی بھی ہم وہاں نہ کھیل سکیں گے۔ اب ہمیں راہداری تک ہی خود کو محدود کرنا ہوگا جہاں ہر طرف پڑوس کے مکانوں میں پتھر پڑے ہوئے ہیں۔

صبح سے ہی شدید بارش ہو رہی تھی اور ہم گھر میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔

"اب اُن کو اندر آتا ہوا دیکھو وہ سب جگہ پھیل جائیں گے" روی بولا۔

"ہر جگہ گیلی مٹی ہے، اُن کے تمام بکسے مٹی میں لت پت ہو جائیں گے"۔

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اُس کی بات سے اتفاق کیا اور اُن لوگوں کو دیکھنے لگا جو ٹرک سے اتر رہے تھے۔ میں روی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بغور دیکھتا رہا۔

"ارے وہ تو مسٹر شنکر ہیں" میں چلایا۔ وہ ہمارے پڑوس میں آرہے ہیں"، "دیکھو روی"۔

میرے جڑواں بھائی نے غیر یقینی نظروں سے اُس شخص کی طرف دیکھا جو ایک لمبا، آنکھوں پر چشمہ لگائے مزدوروں کو حکم دے رہا تھا۔

ہاں یہ وہی ہیں، اُس نے ہلکے سے کہا "اوہ میرے خدا"

ہم اُن کو دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئے۔ کیوں کہ وہ ہمارے میتھس کے ٹیچر تھے جن سے پورا اسکول ڈرتا تھا۔ جن کا ایک لفظ یا صرف نظر ہی ہمیں خوف سے چھُپ جانے کے لیے کافی ہوتی تھی۔

"اب یہ ہمارے بالکل پڑوس میں ہیں" میں نے دہرایا "اب ہم کیا کریں؟"

ہم نے اپنے والدین سے بات کی لیکن انھیں اِس معاملے میں ہم سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

"مسئلہ کیا ہے" ہمارے پاپا نے سختی سے کہا "تم اپنے پڑوسیوں کا انتخاب کسی بھی حالت میں خود نہیں کر سکتے"۔

"جب کبھی تمھیں ضرورت ہو تم اُن سے اپنی پڑھائی میں مدد لے سکتے ہو" ہماری ممی نے بڑے اطمینان سے کہا "تم ہمیشہ میتھس میں کمزور بھی رہے ہو، اب تمہارا مسئلہ حل ہو گیا"۔

روی اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھری۔ ہم کسی بھی طرح اپنی پرابلم اُن کو نہیں سمجھا سکتے تھے۔ یہ سُن کر ہمارے دوستوں نے تو اور بھی ڈرا دیا۔

"کتنا بُرا ہوا" مادھوری نے اظہارِ افسوس کیا، "تم بے چاروں پر ترس آرہا ہے"۔

"تم تو اُسی بس اسٹاپ سے بس لو گے"۔ پردیپ نے رنجیدہ آواز میں کہا۔

جب کبھی بھی اسکول میں تمہارا کام اچھا نہیں ہوگا، وہ تمہارے والدین سے شکایت کریں گے"۔

ہم نے اِس بارے میں تو پہلے سوچا ہی نہ تھا۔ ہم نے پورا دن اسی پریشانی میں گذارا۔ ہم نے میتھس کی کلاس میں زیادہ دھیان لگانے کی کوشش کی لیکن مسٹر شنکر کو دیکھتے ہی ہمارے دماغ سے پورا الجبرا غائب ہو جاتا ہے۔ ایک روز جب ہم ساتھ ہی بس سے اترے، انھوں نے تعجب سے ہمیں دیکھا۔

"کیا تم لوگ بھی یہیں رہتے ہو"۔ وہ غرائے۔

"جی جناب"۔

سر ہم آپ کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ میں ڈرتے ڈرتے بولا، جیسا کہ میرے ساتھ ہمیشہ انھیں دیکھ کر ہو جاتا تھا۔

"اچھا" وہ یہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

اگلی صبح، بس اسٹاپ تک پہنچنے میں ہمیں ذرا دیر ہو گئی۔ کیوں کہ روی کی نظریں اُن کی تلاش میں تھیں۔ آخر کار اس نے اعلان کر ہی دیا۔ "دیکھو وہ جا رہے ہیں"۔

ہم باتیں کرتے ہوئے۔ جان بوجھ کر دیر لگانے لگے۔ لیکن ہماری ممی نے پریشان ہو کر کہا۔ "اب تم لوگ چلے ہی جاؤ"۔ انھوں نے سختی سے کہا۔ اِس طرح تو تمھاری بس چھوٹ جائے گی۔

اُسی وقت روی نے بس کو مڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ اور میں تیزی سے بس کی طرف لپکے۔ ہم اِسی طرح متواتر پانچ دن کرتے رہے۔ مسٹر شنکر ہر مرتبہ ہم کو ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے۔ جب چھٹے دن بھی ہم نے ایسا ہی کیا تو وہ ناراضگی سے بولے۔

"تم لوگ بس اسٹاپ پر ٹھیک وقت پر کیوں نہیں آتے" وہ سختی سے بولے "تمھارا یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے"۔

ہم نے ڈر اور شرم سے اپنے سر جھکا لیے۔ ہمیں اپنی شکست کا احساس تھا۔ اُس کے بعد ہم بس اسٹاپ پر وقت سے پہنچ جاتے اور مسٹر شنکر کے ساتھ کھڑے رہ کر بہت ہی مشکل سے اپنا وقت گذارتے۔ وہ اکثر ہم سے ہمارے نمبروں کے بارے میں پوچھتے رہتے اور ہمارے کم نمبروں پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔

"تم لوگ آج کل پڑھنے پر قطعی دھیان نہیں لگاتے" ایک دن انھوں نے قدرے ناراضگی سے کہا "یا تو تم لوگ ٹی وی دیکھتے ہو یا کسی اور طرح اپنا وقت ضائع کر رہے ہو۔ اِس سلسلے میں کچھ کرنا پڑے گا"۔

اس کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا۔ "میں آج نہیں آرہا ہوں"۔ میں نے شام میں روی سے کہا۔

"کیوں؟ ہم نے اپنا ہوم ورک تو کر لیا ہے"۔

نہیں، کیا تم نہیں جانتے، کون ہمارے پیچھے لگا ہے، میں نہیں چاہتا کوئی وقت ضائع کرتے ہوئے مجھے پکڑے، لیکن اگر وہ کسی سے شکایت کر دیں گے تو کیا ہوگا"۔

لیکن کھیلنا تو صحت کے لیے اچھا ہے۔ روی نے بحث کرتے ہوئے کہا۔ مسٹر رائے کا تو یہی کہنا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ مسٹر رائے ہمارے پی ٹی ٹیچر تھے اور روی کے آئیڈیل۔

"ہرگز نہیں، میں سب سے اگلی سیڑھیوں پر بیٹھوں گا اور پڑھوں گا تاکہ وہ مجھ سے متاثر ہو سکیں۔ اور تمھارا جو جی چاہے تم وہ کرو"۔

روی مایوس ہو کر وہاں سے چلا گیا۔ میں نے ایک موٹی سی کتاب اپنے ہاتھ میں لی اور اگلی سیڑھیوں پر پڑھنے کے لیے

بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد، جب میں اپنے کیے پر پچھتانے لگا تھا، روی ایک کتے کو اپنے ساتھ لایا۔ اِس کالے اور دوست نما جانور کو ہم کئی دن سے اِدھر اُدھر بھٹکتے دیکھ رہے تھے۔ ہم نے اُس کو پڑوس میں جاتے ہوئے بھی دیکھا تھا اور ہم نے اُس کی حفاظت کے لیے خدا سے دعا بھی کی تھی۔ میں فوراً نیچے کودا اور کتے کو پیار کرنے لگا۔

"تم بہت پیارے ہو" میں بڑبڑایا۔ "تمہارا مالک کون ہے" "تمہارے کالر پر کوئی نشان بھی نہیں ہے"۔

کتا خوشی سے دُم ہلا رہا تھا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے آگیا، روی نے فخر سے کہا۔ یہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔

تبھی زور کی آواز سے دروازہ کھلا اور مسٹر شنکر ہماری طرف بڑھے۔

خدایا رحم، روی ڈرتے ہوئے بڑبڑایا۔ میں نے اپنی کتاب کی طرف دیکھا جو کہ اوپر والی سیڑھی پر پڑی تھی۔

"تم لوگ کیا کر رہے ہو؟" وہ شروع ہو گئے۔

روی نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ کچھ نہیں سر ہم پڑھنے جا رہے تھے۔

"بکواس بند کرو، اور میری بات غور سے سنو" مسٹر شنکر زور سے بولے۔

"یہ میرا کتا ہے۔ میں پریشان تھا کہ یہ نہ جانے کہاں چلا گیا ہے"۔

ہم نے تعجب بھری نظروں سے کتے کو اُس کے مالک کے ساتھ جاتے دیکھا جو گھر میں جا کر غائب ہو گیا تھا۔

"خوب" روی نے کہا، ہم نے ایک دوسرے کو پر معنی نظروں سے دیکھا۔

"مجھے پورا یقین ہے، وہ کتے کو ضرور ستاتے ہوں گے" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"وہاں کوئی بھی تو انھیں دیکھنے والا یا اُن کی اطلاع دینے والا نہیں، شاید یہی وجہ تھی کہ کتے کی آنکھوں میں اس قدر مایوسی تھی"۔

"کیا وہ ایسا کرتے ہوں گے" روی نے سوالیہ نظروں سے پوچھا"۔ خوب "تم کس طرح اِس نتیجہ پر پہنچے؟"، "کیا اُس کی آنکھیں گائے جیسی تھیں؟" جب سے روی نے بلّی اور کتے میں تمیز کرنا سیکھی تھی وہ جانوروں کا دوست بن گیا تھا۔

"بچو، تم لوگ کیا کر رہے ہو؟۔ ہماری ممی نے باہر آکر ہم سے کہا۔

"میرا خیال ہے، شاید کل تمہارا میتھس کا امتحان ہے، ہے نہ؟"

جی ہاں! روی نے غمزدہ لہجے میں جواب دیا۔ ہم نے تیاری کر لی ہے، وہی پرانے سوال و جواب"۔

اگلے روز وہی گھسے پٹے سوال ہماری ناکامی کا سبب بنے۔ شاید مسٹر شنکر نے بہت ہی سخت سوالوں کا انتخاب کیا تھا۔ اگرچہ ہم نے اپنے دماغ پر بہت زور ڈالا اور سوالوں کو حل کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ہم جواب نہ نکال سکے۔

اوہو، کلاس کے بعد مادھوری نے اپنی آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا۔ "کتنا مشکل امتحان تھا۔ تم دونوں نے اُنھیں ناراض کر دیا شاید اِسی وجہ سے وہ بدلہ لے رہے ہیں"۔

"جب ہمیں ہماری کاپیاں لوٹائی گئیں ہمیں بے حد ذلت اٹھانا پڑی، کیوں کہ ہم سب فیل ہو گئے تھے اور اب مسٹر شنکر کی سخت ناراضگی اور چبھتی ہوئی آنکھوں کے سامنے تھے۔

"تم سب لوگ نالائق ہو، وہ گرجنے لگے۔ میں نے تمھیں ایک آسان سا ٹیسٹ دیا تھا اور تم ایک بھی سوال نہ کر سکے"۔

روی تمام دن اپنے نمبروں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک ناکام میتھس کے ماہر کی طرح تصور کیا اور وہ اپنی اس طرح کی ناکامی پر پریشان ہو گیا میں نے اُس کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی۔

"ارے آؤ، روی، میں نے شام کو اس کو کھینچتے ہوئے کہا۔ مدت ہوئی ہم نے آنکھ مچولی والا کھیل بھی نہیں کھیلا"۔

"نہیں" اس نے سختی سے کہا۔ "میں"...... وہ بولتے بولتے رُک گیا، کانوں میں کسی کے زور سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ یہ آوازیں ہمارے پڑوس کے باغیچے سے آ رہی تھیں۔ تجسس میں گھرے ہم باڑھ کی طرف لپکے اور اندر جھانکنے لگے، جو کہ کبھی ہمارے کھیلنے کی جگہ ہوا کرتی تھی۔

مسٹر شنکر گھاس پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں ایک (Frisbee) تھی اور کتا اِدھر اُدھر سے اُسے چھیننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ارے وہ ہنس رہے ہیں" روی نے تعجب سے کہا۔

میں حیران رہ گیا، شاید میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔

مسٹر شنکر نے اچانک نظریں اُٹھا کر دیکھا اور وہ ٹھٹھک گئے۔

دو بچوں کو وہاں چپکے سے جھانکتا ہوا دیکھ کر، اُن کی توجہ کھیل سے ہٹ گئی۔ اُن کے ہاتھ سے غلط طریقے سے (Frisbee) چھوٹ گئی۔ لیکن اِسی بیچ انھوں نے اپنا ذہن بنا لیا۔

"کیا تم کھیلنا چاہتے ہو؟ انھوں نے پوچھا۔

روی نے مجھ سے پہلے ہی خود کو نارمل کر لیا تھا۔

جی جناب، اُس نے جواب دیا اور مجھ کو بھی اندر کی طرف کھینچ لیا۔

کتا دوڑتا ہوا ہمارے قریب آ گیا اور ہمارے ہاتھوں کو پیار کرنے لگا۔

"ٹریگو، تمھیں پیار کرتا ہے" مسٹر شنکر بولے۔

"ٹریگو" میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

اس کا نام ٹرگنو میٹری پر ہے، انھوں نے وضاحت کی۔ آؤ تم وہاں کھڑے ہو جاؤ میں (Frisbee) تمہاری طرف پھینکوں گا۔"

ایک گھنٹے بعد ہم اپنی کتابیں لینے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے۔

"تم لوگ کہاں چلے" ممی نے سوال کیا۔

"پڑوس میں" مسٹر شنکر میتھس میں ہماری مدد کریں گے۔"
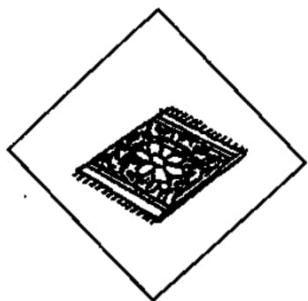
جادوئی قالین

تھی تاوورا

"وکی، دیکھو تم نے یہ کیا کیا ہے" دیویا ناراضگی سے بولی "تم کو ذرا ممی کو بھی اسے دیکھ لینے دو!"

وکی نے ڈرتے ہوئے، اس رنگ کے بڑے دھبے کی طرف دیکھا جو کہ نئے قالین پر پھیل گیا تھا۔

"ممی کے آنے سے پہلے ہی ہم اسے کیوں نہ صاف کر دیں" اس نے کہا۔

"یہ کام تمہارے لیے میں کروں گا" ایک آواز آئی۔

دونوں بچے تعجب سے ٹھٹھک گئے۔ انھوں نے قالین کی طرف دیکھا۔ آواز شاید وہیں سے آئی تھی۔ تبھی، اُن کی آنکھوں کے سامنے، رنگ کا بڑا دھبہ غائب ہو گیا۔ بالکل غائب، بالکل اسی طرح، جیسے کہ انھوں نے کچھ کیا ہی نہ تھا۔

وہ ابھی بھی تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ تبھی اُن کی ممی آ گئیں۔ تم دونوں کیا دیکھ رہے ہو؟ انھوں نے پوچھا۔

ممی! قالین، "یہ تو بولتا ہے" ...... دیویا ہکلاتے ہوئے بولی۔

"یہ تو جادوئی قالین ہے"۔...... وکی نے کہا۔

"دیویا! میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ وکی کے دماغ کو اپنی اُلٹی سیدھی باتوں سے خراب نہ کرو"۔ قالین بولتے ہیں، اس کے بعد کیا کہو گے، مسز مہرہ غصے سے بولیں۔

وہ لوگ ٹیلی ویژن پر کرکٹ میچ دیکھ رہے تھے۔ وِکّی کی آنکھیں ٹی وی پر لگی تھیں اور وہ Bowl سے چپس نکال کر کھائے جا رہا تھا۔

آؤٹ!...... یہ کہہ کر وہ خوشی سے اِدھر اُدھر اُچھلنے لگا۔ اِس کود پھاند میں کچھ چپس نیچے گر گئے۔ اِس سے پہلے کہ وہ اُنھیں اُٹھاتا، وہ غائب ہو چکے تھے۔

ہُم...... یہ کافی مزیدار تھے...... ایک اچھی سی آواز گونجی۔

ڈیڈی، دیکھو یہ قالین پھر بول رہا ہے، وِکّی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

دویا، نے اپنا سر ہلایا، اُس نے بھی یہ آواز سُن لی تھی۔

سنو! اُس نے قالین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "تم کون ہو؟"

میں عزیز ہوں، اُن لڑکوں میں سے ایک جنھوں نے اِس قالین کو بنایا تھا، قالین نے جواب دیا۔

"تم ایک چھوٹے بچے لگتے ہو۔ تم نے کس طرح اِس قالین کو بنایا" دویا نے یقین نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

وہاں، مجھ سے بھی چھوٹے بچے ہیں جو وہاں کام کرتے ہیں، عزیز نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

"کہاں" وِکّی نے پوچھا۔

"قالین کی فیکٹری میں، جہاں میں رہتا ہوں" عزیز نے جواب دیا۔

"اگر تم وہاں رہتے ہو تو تمہاری آواز یہاں کیسے آئی؟ دویا نے سوال کیا۔

"ہاں سنو، ایک روز جب میں یہ قالین بنا رہا تھا، میں دن میں ہی خواب دیکھنے لگا۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ اِس قالین کو خریدیں گے، مجھے بھی گھر لے جائیں گے۔ جب تمہاری ممی نے یہ قالین خریدا، میرا خواب بھی پورا ہو گیا"۔

"تم اصل میں کس جگہ ہو" وِکی نے سوال کیا۔

"وہیں کارخانے میں"۔

"کیا تم وہاں خوش نہیں ہو؟" وِکّی نے پوچھا۔

"خوش؟" "ہم وہاں صبح پانچ بجے سے رات آٹھ بجے تک کام کرتے ہیں۔ دوپہر کھانے کے لیے صرف ایک گھنٹے کی چھٹی ہوتی ہے۔ جیسے ہی ہم اپنا کام ختم کرتے ہیں، ہم اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کھیلنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہم سیدھے سونے کے لیے چلے جاتے ہیں"۔

"اس کا مطلب یہ کہ تم اسکول نہیں جاتے ہو؟" وِکّی نے اظہارِ افسوس کیا۔

ہم بھی اسکول جانا چاہتے ہیں، لیکن ہمارے ماں باپ بے حد غریب ہیں۔ وہ ہمیں کام پر لگا دیتے ہیں، شاید یہ سوچ کر

کہ ہم وہاں بہتر رہیں گے۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہمارے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ کاش میں گھر واپس جاسکتا"
ایک روتی ہوئی آواز اُبھری۔

"ویدی، عزیز رو رہا ہے" وکی نے آنسو بھرے لہجے میں کہا۔

"عزیز روؤ نہیں، ہم تمھاری مدد کریں گے، ہم تم سے کس طرح مل سکتے ہیں، ہمارا مطلب ہے، اصلی عزیز سے؟ دیویا نے پوچھا۔

"ہاں"! عزیز نے غیر یقینی انداز میں کہا۔ "اگر تم کارخانے آؤ گے، شاید آؤ گے"۔ وہ خاموش ہو گیا، تبھی مسٹر مہرا کمرے میں داخل ہوئے۔

دیویا دوڑتی ہوئی اُن کے پاس پہنچی۔ "ہم قالین کی فیکٹری میں جانا چاہتے ہیں"۔

"عزیز سے ملنے" وکی بیچ میں بولا۔

"حقیقی عزیز سے" دیویا زور دے کر بولی۔

"یہ سب کیا ہے" "عزیز کون ہے؟" "اُن کے پاپا نے پوچھا جو حیران اور پریشان تھے۔

"پاپا، عزیز وہ لڑکا ہے جس نے یہ قالین بنایا ہے"۔ "یہ ایک خوابی قالین ہے، یہ ہم سے بات بھی کرتا ہے"۔ دیویا نے وضاحت کی۔

"دیویا میں نے تم سے کہا تھا، تم تصور کی دنیا میں مت کھو جایا کرو۔ تم اس میں پوری طرح کھو چکی ہو" مسز مہرا نے سختی سے کہا۔

"نہیں یہ میرا تصور نہیں"، دیویا نے احتجاج کیا۔ "پلیز پاپا" اُس نے پاپا سے عزیز کی پوری کہانی کہہ ڈالی۔

انھوں نے پوری توجہ سے سنا اور پھر بولے، ہم اتوار کے دن عزیز سے ملنے چلیں گے۔

"ارے آپ بھی کہاں ان کو لے کر قالین فیکٹری جائیں گے"۔ مسز مہرا نے تعجب سے کہا۔ "دیویا کو مزیدار قصّے سنانے کی عادت ہے۔ اُس نے وکی کو بھی یقین دلادیا ہے"۔

"اگر ایسا بھی ہے تو بھی جانے میں نقصان کیا ہے"۔ مسٹر مہرا نے دلیل دی۔ ملک صاحب کارخانہ دیکھنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں دیتے کیوں کہ وہ نہیں چاہتے کہ لوگوں کو پتا چلے کہ انھوں نے بچوں کو ملازم رکھ چھوڑا ہے مگر انھوں نے اگر محسوس کیا کہ آپ قالین خریدنا چاہتے ہیں تو وہ راضی ہو سکتے ہیں"۔

بچوں نے یہ سب اپنے پاپا کو کارخانے جاتے ہوئے راستے میں بتایا۔ کارخانے میں اُن کی ملاقات ایک موٹے ادھیڑ عمر کے آدمی سے ہوئی۔ "شاید یہی ملک ہوں گے" دیویا نے وکی کے کان میں سرگوشی کی۔

"خوش آمدید! خوش آمدید۔ کیا آپ قالین خریدنا چاہتے ہیں؟"۔ اُس آدمی نے پوچھا اور اپنے ساتھ ایک کمرے میں

لے گیا جہاں مختلف رنگوں اور سائزوں کے قالین نمائش کے لیے رکھے گئے تھے۔

کچھ قالین دیکھنے کے بعد مسز مہرا نے کہا۔ "میرے بچے دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ قالین کس طرح تیار کیے جاتے ہیں"۔ کیا آپ ہمیں دکھا سکتے ہیں؟

اُس شخص کے چہرے پر ایک محتاط سے تبدیلی نظر آئی۔

مسز مہرا نے انتہائی لا پرواہی سے ایک سرخ قالین کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بہت اچھا ہے"۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے مسٹر مہرا سے کہا۔

ملک کا چہرہ کھل اُٹھا۔ "میڈم واقعی آپ کی پسند بہت اعلیٰ ہے اور اُس نے قالین کو کھولنا شروع کر دیا"۔

اِس کے بارے میں ہم بعد میں سوچیں گے، اِس سے پہلے ہم کرگھا دیکھیں گے" مسز مہرا بولیں۔

وہ شخص ذرا ہچکچایا، اُس کو تامّل ہو رہا تھا، لیکن بیچنے کا ایک موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا۔

"ضرور، ضرور بڑی خوشی سے، اِدھر آیئے"، آخر کار وہ راضی ہو ہی گیا۔

وہ اُن کو صحن سے گذارتا ہوا ایک پتلے سے دروازے سے ایک نیم تاریک کمرے کے اندر لے آیا۔ باہر کھلی دھوپ کے بعد، انھیں بمشکل ہی اندر کچھ نظر آرہا تھا۔ آہستہ آہستہ مختلف قسم کے کرگھے اُن کی نظروں کے سامنے آگئے اور ان کرگھوں پر تقریباً بیس بچے کام کر رہے تھے۔ ہر جگہ اُون کا رُواں اُڑ رہا تھا۔ وِکّی کو تو سانس لینا مشکل ہو گیا وہ کھانسنے لگا۔

"یہ ہمارا کارخانہ ہے"۔ ملک نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔

"یہ بچے؟" اِن بچوں کو ملازم رکھنا تو شاید غیر قانونی ہے؟" مسٹر مہرا نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

قانون، صاحب، کیا قانون انھیں روٹی دے گا؟ میں اِن کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔ اِن کے گھر میں کھانے تک کو نہیں ہے"۔ اُس شخص نے بڑی شان سے کہا۔

اِسی بیچ، وِکّی اور دیویا نے بچوں کے چہرے کو دیکھا۔ زیادہ تر بچے آٹھ سے بارہ سال کی عمر کے تھے۔ وہ سہمے ہوئے تھے۔ جب کہ کچھ شرماتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔

یہ دیکھ کر بچوں نے کام روک دیا ہے۔ "ملک اُن پر زور سے چلایا، "اپنا کام کرتے رہو، وقت برباد مت کرو"۔

بچوں نے فوراً گرہ لگانا شروع کی اور اُون کے دھاگوں کو کاٹنے لگے۔ سوائے ایک دُبلے پتلے کالے رنگ کے بچے کے جو اُن کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ دیویا اُس کے پاس گئی۔ "عزیز" اُس نے یقینی نظروں سے اُس بچے سے پوچھا۔ بچے نے اپنا سر ہلا دیا، وہ بھونچکا سا انھیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا تم ہمیں جانتے نہیں؟" تمہارا خواب ہی ہمیں تمہارے پاس لے آیا ہے۔

بچے کے چہرے پر ایک مردہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "آپ آ گئے"۔ "کیا واقعی آپ لوگ آ گئے" اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

بچوں کو اس بچے سے بات کرتا ہوا دیکھ کر مسز مہرا اُن کے پاس آ گئیں۔

"یہ کون ہے، دیویا" انھوں نے جاننے کی کوشش کی۔

"ممی، یہی عزیز ہے، جس نے قالین کے ذریعہ ہم سے بات کی تھی"۔

مسز مہرا نے تعجب سے عزیز کی طرف دیکھا۔ "کیا تم واقعی ان سے بات کرتے تھے؟"

عزیز بچے کی طرف دیکھنے لگا، "میں اپنے آپ ہی بات کر رہا تھا۔ میں اکثر کام کرتے وقت ایسا کرتا ہوں، خاص طور پر جس وقت میں اپنے گھر کے بارے میں سوچتا ہوں۔

مسز مہرا نے شفقت سے عزیز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، جس پر زخم کے گہرے نشان موجود تھے۔

"اُون کاٹنے میں یہ زخم لگ جاتے ہیں"۔ اُس نے وضاحت کی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے" مسز مہرا نے پوچھا۔

"بہار میں، ملک چار سال قبل ہمیں اچھا کھانا اور اچھی تنخواہ کے وعدے پر یہاں لے آیا۔ میرے ماں باپ بے حد غریب ہیں، اِس لیے وہ راضی ہو گئے۔ لیکن ملک نے ہم کو آج تک ہماری تنخواہ نہیں دی۔ وہ ہمیں بھوکا رکھتا ہے اور مارتا بھی ہے۔ اُس نے ایک سال میں ہمیں ہمارے گھروں کو بھیجنے کا وعدہ کیا تھا...... لیکن پچھلے چار سال میں میں نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا"۔ عزیز کا چہرہ مرجھا سا گیا تھا۔

مسٹر مہرا بھی اُن کے پاس آ گئے تھے۔

"یہ عزیز ہے" مسز مہرا نے کہا۔

مسٹر مہرا کی آنکھیں تعجب سے پھیل گئیں۔ مسز مہرا نے عزیز کی پوری داستان انھیں سنا دی۔

"کیا ہم عزیز کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے جا سکتے ہیں؟" دیویا نے پوچھا۔

"ابھی انتظار کرو" پاپا نے جواب دیا۔ "ایسا لگتا ہے یہ شخص بچوں کو غیر قانونی طور پر یہاں ملازم رکھتا ہے۔ اگر ہم اس وقت کچھ بھی کرتے ہیں، تو اس کو شبہ ہو جائے گا اور پھر وہ اِن بچوں کو چھپانے کی کوشش کرے گا، اُنھیں نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

"ہم ابھی تو واپس جائیں گے اور حکومت کے ذمہ دار لوگوں کو خبر کریں گے۔ صرف عزیز کو ہی لے جانا کافی نہیں

ہے۔ اِن سب بچوں کو ہماری مدد کی ضرورت ہے"۔

مسٹر مہرا نے عزیز سے پیار بھرے لہجے میں کہا "میں وعدہ کرتا ہوں، میں بہت جلد تم سب کو یہاں سے لے جاؤں گا۔ صبر سے کام لو اور اِس بارے میں کسی سے بھی بات نہ کرنا'۔

عزیز نے سر ہلایا۔

ملک جو ایک دوسرے خریدار کو نمٹانے کے لیے چلا گیا تھا، واپس آگیا۔ اُس نے عزیز کو ہم لوگوں سے باتیں کرتے دیکھا تو اُس کو کچھ شک سا ہوا۔ "کیا آپ اِسے جانتے ہیں" اُس نے پوچھا۔

"نہیں" مسٹر مہرا نے جواب دیا۔ ہمیں اِس بچے کا بنایا ہوا قالین، بہت پسند آیا۔

"جی ہاں، یہ ایک اچھا کاریگر ہے، اگرچہ اکثر تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہے"۔

"ٹھیک ہے ملک جی، ہم نے آج آپ کے کارخانے میں، بہت کچھ سیکھا" مسٹر مہرا نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

جو قالین آپ نے پسند کیا تھا، میڈم اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ ملک نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"آپ اس کو ہمارے لیے رکھ لیں" مسٹر مہرا نے جواب دیا۔

"ضرور، ضرور"، ملک خوشی سے بولا۔ "یہ ایک ہفتے میں تیار ہو جائے گا"۔

واپسی میں وکی نے سوال کیا۔ "عزیز کی مدد ہم کس طرح کریں گے؟"

"میں لیبر کمشنر کو اِس بارے میں اطلاع دوں گا اور جو بھی ضروری قدم ہو گا وہ اُٹھائیں گے" پاپا نے جواب دیا۔

گھر پر بچے برابر عزیز کے بارے میں پریشان تھے، ہر روز وہ اُس سے قالین کے ذریعہ بات کرتے اور اُس کی ہمت بڑھاتے رہتے۔ آخر کار ایک صبح، اُن کے پاپا نے اخبار کے پہلے صفحہ پر ایک خبر دکھائی۔ قالین کے کارخانے پر پولس کا حملہ: بیس بچے آزاد کرائے گئے۔ کرگھے کے پاس کئی بچوں کے فوٹو بھی دکھائے گئے تھے۔ وکی اور دیویا نے ہر ایک تصویر کو اچھی طرح دیکھا۔ عزیز کہاں ہے، دیویا نے پریشانی سے کہا۔

"یہاں" اُن کی ممی نے کہا۔ بچے ایک دم پیچھے مڑ کر دیکھنے لگے۔

وہاں دروازے پر، عزیز اپنے دیہاتی ماں باپ کے ساتھ کھڑا تھا۔

"میرے ابّا اور امّی سے ملو" عزیز نے کہا۔ یہ مجھے گھر لے جانے کے لیے آئے ہیں۔ ملک کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہمارے بجائے ہمارے پاپا کو کام پر لگائیں اور پوری تنخواہ بھی دیں۔

"اب میں اسکول جا سکتا ہوں"۔ "بچو تمہارا بے حد شکریہ" اس کی ماں نے کہا۔

"نہیں" دیویا نے جواب دیا، اس کے لیے عزیز کے جادوئی قالین کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔
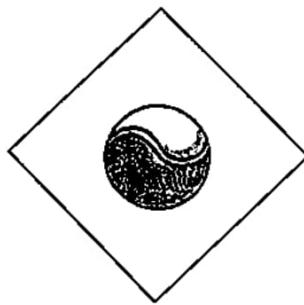
ٹینس کا کھیل

دیپاولی دیب رائے

آج کا دن بہت اہم تھا۔

رانیش جو کہ ساتویں کلاس کا طالب علم تھا، اسکول کے ختم ہونے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ کیوں کہ آج فوراً اسکول کی چھٹی کے بعد، اسپورٹس کمپلیکس میں ٹینس کا سیمی فائنل میچ ہونے والا تھا۔ وہ اسکول سے سیدھا جائے گا جو کہ تھوڑی ہی دور پر تھا۔

رانیش کو کھلے میدانی کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ پچھلے سال وہ علاقے کے ٹینس ٹورنامنٹ فائینل میں آتے آتے رہ گیا تھا۔ اس مرتبہ وہ اِس موقعہ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

"لیکن کیا تم نے تاریخ کا مضمون اچھی طرح پڑھ لیا ہے؟" ونے نے پوچھا۔

"آج اِس کا ریویژن ٹیسٹ ہے"۔

"میں بالکل بھول گیا" بہرحال، میرے پاس اِس کے لیے وقت بھی تو نہیں تھا"۔

"پھر ٹھیک ہے، سَر ایچ! سے ذرا ہوشیار رہنا" ونے نے تنبیہ کی۔

سَر ایچ (تاریخ کے استاد) ایک بے حد سخت ٹیچر تھے۔ وہ دُبلے پتلے، جوان آدمی تھے، جن کی آنکھوں سے تھکن کے

آثار ہمیشہ نمایاں ہوتے۔ وہ بری طرح ڈانٹتے تھے اور اُن کے شاگرد اُن کو پسند نہیں کرتے تھے۔

میتھس اور فزکس کی کلاسوں میں وہ بیٹھا، دوپہر کے بعد کے تصور میں کھویا رہا۔ اُسے پتا بھی نہ چل پایا کہ کب سَر ایچ کلاس میں آگئے تھے۔

پونیت، میچ میں اُس کے مقابل، گیند پھینکنے میں کمزور تھا "مجھے اُس کی اِس کمزوری کا فائدہ اٹھانا چاہیے"۔ وہ اپنے آپ سے بولا۔

"ہرش وردن کی حکومت کا پائی تخت کیا تھا" سَر ایچ نے سوال کیا۔

"رانیش، تم بتاؤ اور مجھے قنوج نہ بتانا"۔

کیا سروِیس تھی، رانیش نے تصور کیا، اس کو کیسا کھیلا جائے؟

میرا خیال ہے، اِس کا جواب تمہاری عقل سے بالاتر ہے، ٹھیک ہے، یہ (Kanyakubjya) ہے، قنوج تو کسی اور جگہ سے لیا گیا ہے، ٹھیک، وہ کون بادشاہ تھا، جس کو اُدی ہو رہا، یعنی پہلا بور کا خطاب دیا گیا؟"

"اوہ، کس قدر بور ہے" پیچھے سے کسی کی آواز آئی۔

لیکن سَر ایچ کا غصہ تو رانیش پر اتر گیا۔ "کیا تم کسی ایک سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتے؟" بادشاہ بھوجا کی حکومت کے سال بتاؤ؟ پہلا پالا بادشاہ کون تھا؟ اور دوسرا کون؟" انھوں نے لگاتار پے در پے سوال کر ڈالے۔

"آخر میں پالا سلطنت میں کس خاندان کی حکومت تھی؟" تم یہ سب یاد کرو۔ اسکول کے بعد تم مجھے جواب سناؤ گے۔

"لیکن سَر"...... رانیش تقریباً چلا پڑا۔

"تم اسکول کے بعد ایک گھنٹہ مزید رکو گے اور اپنی تاریخ کی کتاب دہراؤ گے۔ مجھ سے اسٹاف روم میں ملنا، میں بھی وہیں ہوں گا"۔

رانیش نے بڑی تکلیف بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن میرا تو آج ٹینس کا میچ ہے"۔ ٹینس! کیا کہا تم نے، کیا تمھیں ٹینس کی تاریخ معلوم ہے؟"

رانیش نے اپنا سَر جھکا لیا۔

یہ ایک فرنچ زبان کا لفظ ہے، ٹینیز، جس کا مطلب ہے "پکڑو انگلستان میں اِس کھیل کی مقبولیت سے پہلے، فرنچ لوگ اِس کھیل کو کھیلا کرتے تھے۔ ایک کھلاڑی جس وقت گیند کو دوسرے کھلاڑی کی طرف پھینکتا تو وہ زور سے چلاتا تھا، ٹینیز یعنی پکڑو۔ چینل کے اُس پار انگریزوں کے کانوں کو یہ لفظ، ٹینس لگا۔ کیا تم یہ سب جانتے تھے؟" سَر ایچ سانس

لینے کے لیے رُکے۔ اب میں سب جان گیا، شکریہ، آج مجھے پلیز جانے دیجیے"۔ رانیش نے بہت ہی روتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"کوئی بہانہ نہیں چلے گا"۔ سَر ایچ نے سخت لہجے میں کہا۔

سَر، پلیز ہونے نے منّت کی، وہ آج کسی طرح بھی اپنی میچ نہیں چھوڑ سکتا۔

سَر ایچ نے اُس کی جانب عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

"سَر یہ میچ بہت اہم ہے" رانیش نے پھر کہا۔

سَر ایچ ہرگز نہیں مانے۔

رانیش اسکول سے ہی دوسرے بچوں کے ساتھ وہاں سے کھسک جانا چاہتا تھا لیکن جیسے ہی آخری کلاس ختم ہوئی۔ سَر ایچ اُس کے ڈیسک کے پاس آئے اور اُسے اپنے ساتھ اٹھالے گئے۔ رانیش نے تھوڑی ہی دیر میں اپنے آپ کو خالی ہوتے ہوئے اسٹاف روم کے ایک کونے میں بیٹھا پایا۔ "شمال کی سلطنتوں کے بارے میں خاموشی سے پڑھتے رہو" سَر ایچ نے ہدایت کی۔ میں تھوڑا تھک سا گیا ہوں۔ دیکھو مجھے پریشان مت کرنا۔"

رانیش بیٹھا اپنی تاریخ کی کتابوں کو چاٹتا رہا اور دوسری طرف اسپورٹس کمپلیکس میں ہرے بھرے میدان میں ٹینس کا میچ جاری رہا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے اور اِن آنسوؤں میں تاریخیں دھندلا سی گئیں۔ جب بھی وہ اپنے پیروں کو اِدھر اُدھر چلاتا، یا اپنی سیٹ میں پہلو بدلتا۔ سَر ایچ اُس پر ایک سخت نگاہ ڈالتے۔ اگرچہ وہ اسٹاف روم کے دوسرے کونے میں بیٹھے تھے۔ اپنی کتاب لیے اُس کے صفحات میں کھوئے ہوئے تھے اور اپنا سَر بھی کتاب سے نہ اٹھاتے تھے، سوائے اُس وقت کے جب رانیش ذرا سا بھی ہلتا تھا۔

مجھے اِس شخص سے سخت نفرت ہے، رانیش نے سوچا۔

اچانک سَر ایچ کی بھنچی سی چیخ نکلی اور وہ میز پر لڑھک گئے۔

سَر کیا ہوا؟ رانیش اپنی سیٹ سے اُچھلا اور اُن کے پاس پہنچ گیا۔ سَر ایچ بالکل نچڑے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ رانیش نے اُن کا کندھا جھنجوڑا، لیکن انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجھے پانی لانا چاہیے۔ رانیش یہ سوچ کر اسٹاف روم سے باہر کی طرف بھاگا۔ کوریڈور کے آخیر میں لگے کولر سے وہ ٹھنڈا پانی لے کر ایک بار پھر اسٹاف روم کی طرف لپکا۔ اُس نے پانی کو اُن کے سر پر ڈال دیا۔

سَر ایچ تھوڑے ہوشیار ہوئے اور کچھ بڑبڑائے۔

"یس سَر؟"

سَر تھومس رو...... جہانگیر کی عدالت......۱۷......"

ارے، اس وقت بیہوشی میں ہسٹری کی تاریخیں!" رانیش بولا جونہی انھوں نے اپنی آنکھیں کھولیں، سَر ایچ نے شکریہ کہااور اٹھنے کی کوشش کی۔

لیکن وہ اپنے آپ نہ اُٹھ سکے۔

"میرا سَر دُکھ رہاہے" وہ تکلیف سے بولے۔

رانیش نے اپناہاتھ سَر ایچ کی کمر میں ڈالا اور سہارا دے کر اٹھایا۔ وہ دونوں سہارے سے دروازے تک پہنچے اور پھر وہاں سے زینہ سے نیچے اُتر کر مین گیٹ کی طرف چلے۔ رانیش نے چوکیدار سے اُن کے لیے ایک آٹو رکشالانے کے لیے کہا۔ چوکیدار کی مدد سے اُس نے سَر ایچ کو رکشے میں بٹھایا۔

سَر ایچ نے کسی طرح اپناپتابتایااور آنکھیں بند کر کے سیٹ میں غرق ہوگئے۔

رانیش نے اُن کو اکیلا جانے دینا مناسب نہیں سمجھااور وہ خود بھی آٹو رکشہ میں اُن کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اتفاق سے اُس کے پاس کچھ پیسے موجود تھے۔

سَر ایچ نے جو پتادیاتھا، وہ ایک پرانے خستہ مکان کا تھا، جس کے کچھ حصے محفوظ تھے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے۔ سَر ایچ نے اپنی جیب سے ایک چابی نکال کر دی اور ایک طرف ڈھلک گئے۔ رانیش کو ہی دروازہ کھولناپڑا۔

کمرے میں بمشکل ہی کچھ سامان تھااور نہ ہی کچھ کھانے پینے کے لیے۔ زیادہ تر یہ کتابوں سے بھرا تھا۔ ہر جگہ کتابیں ہی کتابیں، چھپی ہوئی لیکن بغیر جلد کے، پڑھنے کے لیے بے حد مواد موجود تھا، براؤن لفافے بڑی تعداد میں پڑے تھے۔ سادے لکھنے کے کاغذوں کے ڈھیر تھے، تمام فرش پر یہ سب چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

"سَر میں آپ کے واسطے کچھ کھانالے آؤں"۔ رانیش نے انھیں بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ اُس نے مخالف سمت میں فاسٹ فوڈ کی ایک دوکان دیکھی تھی، وہ فوراً زینے سے نیچے اُتر کر چلا گیا۔

"ایک ہمبر گراور ایک پیزا" اُس نے دوکان دار سے دینے کو کہا۔

"جلدی کرو" اُس نے ایک کولڈ ڈرنک بھی لی اور پھر فوراً سَر ایچ کی طرف بھاگا۔

سَر ایچ نے کچھ کہنے کی کوشش کی، لیکن رانیش نے ایک دم پیزا اُن کے منہ کے پاس کر دیااور وہ کچھ نہ کہہ سکے۔

شاید وہ بے حد بھوکے تھے، رانیش نے سوچا، وہ سَر ایچ کو پیزا کھاتے ہوئے دیکھ رہاتھااور فوراً اس کے بعد وہ ہمبر گر پر ٹوٹ پڑے تھے۔

اُس نے کولڈ ڈرنک اُن کو دی۔ سَر ایچ نے ایک لمبا سا گھونٹ بھرا۔ شک...... شکریہ، انھوں نے تھکی آواز میں کہا،

اور اپنے آپ ہی سے بولنے لگے۔ اس مرتبہ سروسز میں ضرور آنا چاہیے۔ اس مرتبہ فیل نہیں ہونا چاہیے"۔ ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

رانیش نے اُن کو بستر میں آرام سے لٹادیا اور گھر کے لیے چل دیا۔

جب وہ گھر پہنچا، اُس کے ماں باپ اُس کے لیے پریشان تھے اور خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ میچ کھیلنے نہیں پہنچا تھا، جس کا وہ اتنی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ ونے اور اُس کی کلاس کے دوسرے بچے......

جو سبھی فائینل دیکھنے گئے تھے۔ انھوں نے بتادیا تھا کہ سَر ایچ نے رانیش کو اسکول ہی میں روک لیا تھا۔ اُس کے والدین اُس کو دیکھنے اسکول بھی گئے تھے۔ لیکن اُس وقت تک اسکول کے گیٹ بند ہوگئے تھے اور وہاں چوکیدار بھی نہیں تھا۔ وہ گھر واپس آگئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔ ممی تو بے حد پریشان ہوچکی تھی جس وقت رانیش گھر واپس آیا اور تب اُن کی جان میں جان آئی۔

رانیش کے بارے میں ونے بھی پریشان تھا، اِسی لیے وہ بھی وہاں آگیا۔ اُس نے رانیش سے کہا، جب سَر ایچ نے اُسے روکا تھا، وہ تبھی سمجھ گیا تھا تمہارا مخالف، پونیت اب بآسانی فائینل میں پہنچ گیا تھا اور "وہ بھی سَر ایچ کی بدولت"۔

رانیش نے اُن کو اسٹاف روم اور اس کے بعد کی پوری داستان سنائی۔

اگلی صبح جو کہ اتوار کی صبح تھی، رانیش دوبارہ سَر ایچ کے گھر کچھ گھر کا پکا کھانا اور تھوڑی چاکلیٹ لے کر گیا۔

رانیش کو سَر ایچ کچھ بہتر نظر آئے۔ اُن کی آنکھوں کے گرد ابھی بھی کالے حلقے بنے ہوئے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ رانیش کو دیکھ کر اُٹھ گئے۔

تم مجھے کل گھر لے کر آئے، میں بے حد مشکور ہوں۔ تھوڑے توقف کے بعد وہ بولے، میں شاید کل بے ہوش ہوگیا تھا۔ کیوں کہ میں بے حد تھکا ہوا تھا مجھے تمہارے میچ کے مِس ہونے کا بے حد افسوس ہے۔

شاید میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی۔

"یس سَر" رانیش ایک دم بولا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ، جب میں بے ہوش ہوگیا تھا، تمہارے پاس اچھا موقعہ تھا، تم میچ کھیلنے کے لیے بھاگ سکتے تھے۔ دوسرے کھلاڑی کو واک اوور دینے سے پہلے عام طور پر لوگ انتظار کرتے ہیں۔ تم نے اِس موقعہ سے کیوں فائدہ نہیں اٹھایا؟"

"میرے دماغ سے کھیل تو یک سَر نکل چکا تھا" رانیش نے سادگی سے جواب دیا۔

سَر ایچ کی آواز قدرے بھاری ہو گئی جب انھوں نے کہا، میں جانتا ہوں میں تمہارے لیے کچھ کر تو نہیں سکتا، پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ کیوں نہ تم مجھ سے تھوڑی سی ٹینس کوچنگ بھی لے لو؟ سَر ایچ نے پوچھا۔ "ہم ہر روز اسکول کے بعد اسپورٹس کمپلیکس چلا کریں گے"۔

رانیش کو حیران دیکھ کر، وہ ہنسے۔ "میں انٹر یونی ورسٹی چیمپین تھا، جس وقت میں نے ٹینس چھوڑا کیوں کہ میں نے سوچا، میں پڑھائی کو زیادہ وقت نہ دے سکوں گا۔ اصل میں میں تیسری مرتبہ سول سروس ایگزامی نیشن میں بیٹھ رہا ہوں"۔

انھوں نے رانیش کو تفصیل سے بتایا کہ یہ ایک بہت سخت مقابلہ جاتی امتحان ہوتا ہے اور اِس امتحان میں ہسٹری ایک اہم مضمون تھا۔ عام طور پر لوگ اِس امتحان کو اُس وقت دیتے ہیں جب وہ کہیں کام کر رہے ہوتے ہیں۔ جب بھی وہ اس کو پاس کر لیتے ہیں وہ اعلا افسر کے عہدے پر ملک کی خدمت کرتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں پر یہ ایک بڑا بوجھ بن جاتا ہے کیوں کہ پڑھائی اور کمائی دونوں ساتھ کرنا پڑتی ہے۔ کسی اور چیز کے لیے وقت ملتا ہی نہیں۔

"پچھلے چند سالوں سے میں اپنی کتابوں میں کھویا رہتا ہوں اور ساتھ ہی ساتھ دو وقت کی روٹی جٹانے میں بھی۔ میں کم کھا کر پیسہ بچاتا ہوں اور زیادہ سے زیادہ پڑھ کر وقت بچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسکول میں تم لوگوں کو پڑھاتے ہوئے در حقیقت میں خود اپنے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ خاص طور پر ہسٹری کے مضمون میں۔

"وہ بہت دیر تک شاید اپنے آپ سے ہی بولتے رہے۔ دو مرتبہ پہلے بھی میں اِس امتحان میں بیٹھ چکا ہوں، ہسٹری میں کم نمبروں کی وجہ ہی سے میں ناکام ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے، اِس مرتبہ میں ایسے نہیں ہونے دوں گا"۔

"میں شاید دوسری جانب شدت سے مائل ہو گیا تھا" رانیش نے کہا۔ تمام دن کھیلنا اور کوئی کام نہ کرنا، اب آج سے میں اپنی تعلیم پر سب سے زیادہ توجہ دوں گا"۔

"اور کیا تم مجھے ایک اور موقع نہیں دو گے، کیوں؟" سَر ایچ نے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ میری کچھ زیادہ اچھی ہسٹری نہیں رہی...... لیکن......"

میں اِس سب کو بھول جاؤں گا سَر" رانیش نے کہا، آپ تو جانتے ہی ہیں میں ہسٹری بھولنے میں کتنا استاد ہوں"۔

ہزہائی نس

ہوماگنی چودھری

آج کی صبح بہت ہی خراب تھی۔ دادو دادا جان لائبریری میں کچھ کتابیں دیکھنا چاہتے تھے۔ انھوں نے دوپہر کا کھانا بھی جلدی کھالیا۔ ممی نے اُن سے کہا کہ پوجا کی وجہ سے آج ہر چیز بند ہوگی۔ دادو، ناکارہ اور سست قسم کے لوگوں سے بہت نفرت کرتے تھے جو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ چھٹیوں میں مزہ کرنے کی سوچتے ہیں۔ اِن لوگوں کو اپنے فرض کا تو کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ کسی کی دعوت پر ایک مضمون لکھ رہے تھے جو کہ تقریباً تیار تھا لیکن وہ پھر بھی کچھ حوالوں کی کتابیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک کپ چائے کا لے کر دادو بد مزہ ہو گئے تھے۔

"اب ہم گھومنے چلیں گے"۔

پپی، دداک شنڈ، نسل کا کتا، اِس خبر کو سن کر خوشی سے باہر نکل آیا اور اپنی زنجیر خود لے آیا۔

دونوں آرام سے چلنے لگے، تھوڑی ہی دور جاکر اُن کے سامنے ایک پوجا کا پنڈال آگیا جس کی وجہ سے سڑک بند ہو گئی تھی۔ حالاں کہ برابر والی سائڈ سے تھوڑا سا راستہ کھلا تھا۔ لیکن دادو اِس چھوٹے راستے سے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ اِس سے تو بہتر تھا کوئی اور چھوٹا راستہ لے لیا جاتا۔ انھوں نے یہ نہ سوچا کہ ہر طرف پوجا کی سجاوٹ سے، ہر چیز

کی شکل ہی بدل گئی ہے۔ بہت جلدی وہ راستہ بھول گئے۔ پپی نے دادو کی رہنمائی کرنے کی کوشش بھی کی لیکن انھوں نے اُس کو سختی سے جھڑک دیا گیا۔

پھوپھی نی نی پٹشی اور میلو بازار میں کوئی ضروری چیز لینے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اُن دونوں کو دیکھا، جو بُری طرح تھکے ہوئے اِدھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ نی نی پٹشی نے اُن سے پوچھا "کیا آپ راستہ بھول گئے ہیں"۔

دادو نے سَر ہلایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمھیں چاہیے کہ تم کچھ آداب سیکھو اور تھوڑا کامن سینس ہونا بھی ضروری ہے۔ میں کس طرح کھو سکتا ہوں۔ میں تمام گلیوں اور کوچوں سے واقف ہوں۔ پپی ذرا دور تک ٹہلنا چاہتا تھا"۔

پپی نے ہلکی سی غراہٹ کی، شاید اشارہ کیا کہ ہر چیز پوری طرح کنٹرول میں ہے اپنی رسّی کو ذرا کھینچتے ہوئے اُس نے دادو سے گھر واپس چلنے کی یاد دلائی۔

سَرلا، کھانا بنانے والی دو دن کی چھٹی پر اپنے گاؤں جا چکی تھی۔ ممی نے بہت مشکل سے سب کو خوش کرنے کے لیے زور دار کھانا بنایا تھا۔ دادو جو نہ گوشت اور نہ مچھلی کھاتے تھے خاص طور پر اُن کے لیے سبزیاں بنائی تھیں۔ حالاں کہ ان کے بنانے میں خاصا وقت لگ گیا تھا۔ پاپا کے لیے دو قسم کی مچھلی بنائی گئی تھی اور پپی کے لیے گوشت تھا۔ میلو جو کہ بڑھتی ہوئی بچی تھی، ہر چیز کھا سکتی تھی۔ نی نی پٹشی ہلکا کھانا پسند کرتی تھیں اور زیادہ کھانے کے لیے شور مچانا پسند نہ تھا۔

چھٹی والے دن دوپہر کا کھانا ایک ورزش سے کم نہ تھا۔ سرلا ہر ایک کو نام بنام آواز دے گی۔ کم از کم تین مرتبہ جب تک کہ ہر کوئی کھانے کے لیے اٹھ کھڑا نہ ہو۔ پپی ہمیشہ دادو کے ساتھ ہی پکارے جاتے تھے اور وہ دونوں ساتھ ہی آتے بھی تھے۔ لیکن آج لنچ میں دیر ہو گئی تھی۔ جب نی نی پٹشی نے دادو کو آواز دی، وہ صبح کی ٹہل کے بعد کچھ تھک سے گئے تھے۔ اور حواس باختہ سے وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ گئے۔

دادو نے ایک لیمو کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تبھی انھیں محسوس ہوا کہ وہاں پر اُن کا چودہ سالہ ساتھی موجود نہیں ہے۔ "پپی کہاں ہے، انھوں نے تعجب سے آواز لگائی۔

میرے خدا، نی نی پٹشی افسوس بھرے لہجے میں بولیں، اصل میں میں ہز ہائی نس کو بلانا بھول گئی۔ آج کا دن واقعی بڑا خراب ہے۔ میلو، اچھی بچی بنو اور اُس کو اپنے ساتھ لے آؤ"۔

"ذرا احتیاط سے" پاپا نے تنبیہ کی۔

یہ تو ہر ایک کو معلوم تھا کہ جب پپی ناراض ہوتے تھے تو وہ اپنے کمبل میں گھس جایا کرتے تھے جو کہ دادو کے پلنگ

کے نیچے تھااور سوائے دادو کے کسی کو بھی اُس کے قریب جانے کی اجازت نہ تھی۔ پپی اچھی طرح جانتے تھے کہ اِس عمر میں شاید وہ پورے گھر کی رکھوالی نہیں کر سکتے لیکن وہ دادو اور اپنی جگہ کی آج بھی اچھی طرح حفاظت کر سکتے تھے۔ چند روز پہلے، جب پاپا، بجائے اندھیرے اور بھرے پُرے راستے سے گذرنے کی بجائے۔ آدھی رات میں چھوٹے راستے سے دادو کے کمرے سے نکلے، وہ فوراً پلنگ کے نزدیک آگئے اور پنڈلی پر منہ مارا۔

دور سے ہی میلو نے پلنگ کے نیچے جھانکا۔ اُس کی آنکھیں جلتے ہوئے کوئلوں کی طرح سرخ تھیں، اب اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ناراض تھا۔

واقعی پپی کا غصہ ٹھیک تھا۔ چودہ سالہ کتّے نے ناراضگی سے اپنا سَر ہلایا۔ کس طرح یہ لوگ اور خاص طور پر دادو اُس کو لنچ پر بلانا بھول سکتے ہیں۔ در حقیقت دادو کے بولنے سے پہلے ہی انھوں نے کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ یعنی پپی چودھری خاندان کی دوسری بزرگ ہستی کو کس طرح بھلا دیا گیا تھا۔ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں وہ تو سب کے سب پورے پپی ہیں۔

پاپا، ممی اور نی نی چیشی اُن کے لیے صرف بیکو، لینا اور نی نی تھے۔ اور میلو کے تو ابھی دودھ کے دانت بھی نہ ٹوٹے تھے۔ جب کہ پپی، پانچ سال کی عمر میں ایک ذمہ دار بالغ تھے۔ گھر کے باہر اکثر وہ، دو سالہ میلو کو ٹہلانے کے لیے لے جایا کرتے تھے۔ وہ اُس کو فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ ہی کھینچے رکھتے اور اس طرح وہ اُس کی حفاظت کیا کرتے۔ اب جب کہ میلو، گیارہ سال کی اور کافی بڑی ہو گئی تھی، پپی اب بھی اُس پر پیار بھری نظریں ڈالا کرتے اور کبھی کبھی تو اُس کو ایک خصوصی رعایت کے طور پر اِدھر اُدھر گھمانے کی اجازت بھی دے دیتے۔

جب پہلی مرتبہ وہ، چھوٹا سا بچہ آیا تھا، وہ اِدھر اُدھر اپنا کھانا بکھیر دیتا اور اس لیے اُس کو ورانڈے ہی میں کھلایا جاتا تھا۔ اب وہ ایک صاف ستھرا کھانا کھانے والا تھا اور کافی عرصے پہلے ہی اُس کی کھانے کی پلیٹ اندر آچکی تھی دادو ایسا ہی چاہتے تھے۔ اُس نے کبھی بھی گندگی نہیں کی، پپی کی جگہ ڈائننگ روم میں ہو گئی تھی۔ وہ دادو کے ساتھ ہی اپنا کھانا بھی ختم کرتے اور اگر کبھی دادو دیر تک کھاتے تو وہ بھی ذرا زیادہ پانی پیتے اور اپنی پلیٹ کو چاٹ چاٹ کر بالکل صاف کر دیتے۔ لیکن بلاوجہ یہ بد تمیز بچے جن کو آداب ہی نہیں آتے اکثر میز پر شور مچاتے، اُن کی بے ادبی کرتے۔ انھیں اِس بات پر غصہ آنے لگتا۔

ہلو کچھ سہمی اور ڈری ہوئی۔ آہستہ سے ڈائننگ روم میں داخل ہوئی اور بتایا "پپی پلنگ کے نیچے ہے اور بے حد غصے میں ہے"۔

"یہ اُس کے بڑھاپے کا ڈھیٹ پن ہے" نی نی چیشی نے رائے دی، بہت بد تمیز ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، جب زیادہ بھوک لگے گی، اپنے آپ باہر آجائے گا"۔

"نی نی، تم ہی اُس کے ساتھ سختی سے پیش آتی ہو" دادو نے اعتراض کیا۔ "پپی ایک شریف کتا ہے، جب تک اُس کو ستایا نہ جائے وہ کبھی غصہ نہیں ہوتا"۔

نی نی چیشی کالج میں میتھس پڑھاتی تھی اور ہر معاملہ میں نظم اور ضبط کی قائل اُس کی بدمزاجی کو نظر انداز کرنا ہی اچھا تھا۔ ممی پریشان تھیں۔ کھانے کا بے حد سامان تھا لیکن گھر کا ایک ممبر کھانے کو تیار ہی نہ تھا۔ انھوں نے پاپا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ کچھ کیجیے"۔ "ٹھیک ہے" میں ہی کچھ کرتا ہوں، میں اُس کو باہر کھینچ لوں گا"۔ وہ اٹھتے ہوئے بولے۔ ممی بھی اُن کے ساتھ چلی گئیں۔

پپی نے یہ سب سنا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اُس کو کھینچا جائے تو وہ کیا کرے اور یہ بھی جانتا تھا کہ وہ لوگ بھی جانتے تھے۔ وہ اصلی نسل کا داک شنڈ تھا۔ ایک اچھا شکاری اور اپنی گلی میں تو وہ کسی سے ڈر ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی اُس نے پہلے خبردار کرنا ضروری سمجھا۔ وہ دوبارہ غصے سے غرّایا۔

ممی پاپا نے اُس کو بلانے کا آئیڈیا ہی چھوڑ دیا اور واپس آگئے۔ دادو نے اپنی بے چارگی پر ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "اگر میرے پیروں میں تکلیف نہ ہوتی تو میں اُس کو باہر نکال لاتا"۔

پپی نے سب کچھ سنا، لیکن جنبش تک نہ کی۔ بچوں کو سزا ملنا ہی چاہیے۔ وہ کوئی سڑک چھاپ بھکاری کتا نہیں تھا۔ وہ اپنی پلیٹ میں رکھے گوشت کو سونگھ رہا تھا۔ مٹن کے صاف ستھرے ٹکڑے۔ کیوں کہ اُس کے دانت کمزور ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی وہ کھائے گا نہیں۔ وہ بھوکا ہی رہے گا۔

پپی دادو کا دوست تھا۔ اُن دونوں ہی سے سینئر سٹی زن کلب تھا۔ جس میں ایک سبزی خور اور دوسرا گوشت خور۔ پاس پڑوس میں بھی اُن کا احترام کرتے تھے۔ جب وہ باہر ٹہلنے نکلتے، بچے سلام کرتے اور دوسرے کتے اپنے آپ راستہ دے دیتے۔

جب وہ پہلی بار گھر میں لایا گیا تھا، اِس نسل کے کتے کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ سڑک کے کتے باہر شور مچایا کرتے اور بے ہودہ قسم کے بچے پپی کا مذاق اڑاتے کہ وہ تو فقط چوہوں کا شکاری ہے، اور ایک اچھا کتا نہیں ہے۔ لیکن اُس کے اٹھان سے سب ہی متاثر تھے اور جلد ہی اُس کے خاندانی رعب و جلال کے قصے ہر جگہ پھیل گئے۔ پپی نے ایسا ثابت بھی کر دکھایا، وہ دادو اور پورے گھر کا وفادار تھا۔ لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اُس کی وہ وقعت نہیں رہ گئی تھی، حد یہ کہ نی نی یا میلو بھی اُس کی وہ پرواہ نہیں کرتی تھیں۔ دادو اور اُسے نظر انداز کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ اِن سب کو سبق سکھائے گا۔ وہ بھوکا رہے گا لیکن کھانا کھانے کے لیے کسی سے بھیک نہیں مانگے گا۔

پپی چائے کے وقت بھی باہر نہیں نکلا۔ شام میں ٹہلنے کے لیے بھی نہیں اُٹھا۔ حد تو یہ کہ دادو کے بار بار آواز دینے پر بھی وہ باہر نہیں آیا۔ رات کے کھانے پر گھر کے ہر فرد کا موڈ خراب تھا۔ پپی ابھی بھی پلنگ کے نیچے ہی تھا۔ نی نی پیشی کو اُس کی پچھلی دو دِن کی بھوک ہڑتال اچھی طرح یاد تھی وہ یہ سوچ کر کانپ گئی۔ کل اشٹمی ہوگی، جو اچھے بڑھیا کھانوں کا دِن ہے۔ پپی کو سب سے الگ تھلگ ہونے نہیں دیا جاسکتا۔ نی نی پیشی نے بے خیالی میں اپنے کندھے ہلائے اور فرج کا دروازہ کھولا۔

پپی کو لیور کی سونگھ آگئی تھی اور اُسے معلوم تھا کہ اُس کو اپنے آپ کو روکنا کتنا مشکل تھا۔ نی نی کو وہ بے حد چاہتا تھا۔ وہ اُسے کانوں کے پیچھے سے پکڑتی اور اُس کے منہ میں ایک ساتھ دو دو رس گلے ٹھونس دیتی۔ پپی نے آہ بھری کہ شاید اب اُسے رشوت دی جائے گی۔

جیسا کہ اُس نے سوچا تھا۔ پلنگ کے نیچے نی نی کا چہرہ اُبھرا اور اُس کے ہاتھ میں لیور کا ایک بڑا ٹکڑا تھا۔ پپی یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے، لیکن انھیں یاد آیا کہ داک شنڈ نسل کے کتوں کو رشوت دے کر نہیں خریدا جاسکتا۔ کھانے سے کہیں زیادہ عزت اہم ہے، یہ سوچ کر وہ پھر غرائے۔

نی نی پیشی تھوڑا اور اندر گھُس آئی۔ لیور کے ٹکڑے کی خوشبو اور وہ بھی اتنا بڑا، یہ تو بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ پپی زیادہ تو اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے۔ انھوں نے اپنے سخت ارادے کو چھوڑنا ہی بہتر سمجھا۔ پپی، فوراً باہر نکل آئے۔ نی نی پیشی کے ہاتھ سے اپنی مرغوب غذا چھینی اور تیزی سے چلے گئے۔

میلو نے نی نی پیشی کی خوشی سے بھری آواز سنی اور پھر ایک پپی کے اطمینان بھری "ووف" سنائی دی، وہ دُم ہلاتے ہوئے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔

"بھئی واہ" میلو نے آواز لگائی۔

نی نی پیشی، اپنے ہاتھ دھو کر جب ڈائننگ ٹیبل پر آئی، پپی باہر نکل گئے اپنا لیور کا ٹکڑا لا کر اپنی پلیٹ میں رکھ دیا۔ وہ ہر کام طریقے سے کرتے تھے، کسی قسم کا لالچی پن بالکل نہیں اور انھوں نے نی نی کو بھی معاف کر دیا۔ وہ دو پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ اُس کو پیار کیا اور تھوڑا غرائے جو اِس بات کا اشارہ تھا کہ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ زندگی اتنی بھی بُری نہیں، گرچہ کبھی کبھی کسی بات پر اَڑنا بھی پڑتا ہے۔
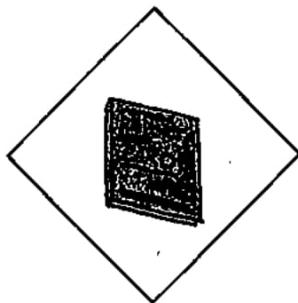
جڑواں شکل

اگیلا گری راج کمار

گھر میں مکمل خاموشی تھی، البتہ کبھی کبھار سسکنے کی آواز ابھر جاتی تھی۔ رنجن کی اس کے پاپا نے پٹائی کی تھی کیوں کہ سہ ماہی امتحان کی رپورٹ آچکی تھی، جس میں صاف صاف لکھا تھا کہ "آگے پروموشن مشکوک ہے"۔

پاپا اپنے کمرے میں پریشانی کے عالم میں تھے، رنجن زمین پر پڑا تھا۔ وہ رو رہا تھا جب کہ اس کا نٹر ممی کی گود میں تھا۔ لیکن روی بہت بھوکا تھا۔ کھانے کا بھی اور اپنی تعریف کا بھی۔ اس نے اپنی رپورٹ کی طرف فخر سے دیکھا، جس پر لکھا تھا "بہت عمدہ کام شاباش، ایسے ہی آگے بڑھتے رہو"۔

وہ اپنی کلاس میں فرسٹ آیا تھا۔ لیکن کسی نے بھی اس کی پرواہ نہیں کی۔ انھوں نے تو صرف یہ دیکھا کہ رنجن تین مضمون میں فیل تھا۔

روی نے فیصلہ کیا کہ وہ اُن سب کو اپنی طرف راغب کرے گا۔ وہ اپنے پاپا کے پاس گیا اور بولا۔ "پاپا، میری رپورٹ دیکھیے"۔

اس کے پاپا نے رپورٹ کو غور سے دیکھا، اس کے کندھے کو تھپ تھپایا اور کہا، "وری گڈ" بس اتنا ہی؟ روی کو بڑا تعجب ہوا۔

اس پر پاپا بولے "اپنی رپورٹ، اپنے بے وقوف بھائی کو ذرا دکھاؤ"۔

"کیا آپ کو مجھ پر فخر نہیں ہے!" لیکن اُسے اپنے والدین کی صلاحیت پر اطمینان تھوڑا کم ہی تھا کہ وہ اس کے احساسات کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ وہ خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے والدین کی طرف سے تعریفی الفاظ کو سننے کے لیے بے قرار تھا۔ لیکن ایسا ہو نہ سکا۔

وہ اپنی ممی کے پاس گیا "اماں، مجھے بھوک لگی ہے"۔

انھوں نے اُس کی طرف دیکھے بغیر سختی سے کہا۔ "کیا تم دیکھ نہیں سکتے، ہر چیز میز پر لگی ہے؟ جو تمہارا جی چاہے کھالو" وہ چڑھ کر بولیں

اُس کا دل ٹوٹ گیا، اُس نے کھانے کا جائزہ لیا، آلو، بہت اچھے تلے ہوئے تھے، جس طرح کہ رنجن پسند کرتا تھا۔ انڈے، رنجن کی پسند کے مطابق ابلے ہوئے تھے۔ روی کو انڈے آلو کا سالن بہت پسند تھا۔ اماں، اِن دنوں میری پسند کا کھانا کیوں نہیں بناتیں؟ یہاں ہر چیز رنجن کی پسند کے مطابق ہی کیوں ہوتی ہے؟ حالاں کہ اُس کے لائق نہیں ہے۔

روی غصّے سے بھر گیا۔ اُس نے پلیٹ سے سارے آلو لے لیے اور چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی سب کے سب کھا گیا۔ اُس کے بعد اُسے انتظار تھا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے؟

اماں بمشکل رنجن کو میز پر لے آئیں۔ انھوں نے آلو کی پلیٹ کو خالی دیکھا وہ روی پر چڑھ دوڑیں۔ "کیا تمہارے پاس تھوڑی سی بھی عقل ہے؟ اب رنجن کیا کھائے گا"۔

اُس کے بھائی کا نام اُس کے اعصاب پر چھا گیا تھا! اُس نے پلٹ کر غصّے سے جواب دیا۔ جو کچھ ہے اُسے وہ ہی کھانے دیجیے، اُسے بھوکا ہی مرنے دیں۔ وہ شاید تبھی سمجھے گا کہ فیل ہونے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔

اُس کی ممی غصّے سے پھٹ پڑیں! "رنجن کو سزا دینے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے"۔ وہ بے حد ناراضگی سے بولیں "تمہارے اُس کی اچھی پٹائی کی ہے اور تم چاہتے ہو کہ وہ بھوکا بھی رہے۔ آخر وہ کیا کرے؟ وہ آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔ وہ تیزی سے آلو خریدنے کے لیے گھر سے نکل گئیں۔

روی نے رنجن کی طرف دیکھا۔ بے وقوف، کمزور انسان۔ جب میں پڑھتا ہوں یہ کھیلنے کے لیے نکل جاتا ہے اور اماں اِس کے پیچھے پیچھے خوشامد کرتی دوڑتی ہیں کہ وہ تھک جائے گا۔ بیٹا دودھ پیو، پھلوں کا رس پیو، اُسے سب کچھ یاد آرہا تھا اگر میں کبھی کسی چھوٹی سی چیز کی بھی فرمائش کر دوں تو وہ کہتیں، کیا یہ کام تم خود نہیں کر سکتے؟ تم دونوں کے پیچھے میں کس طرح دوڑتی رہوں"۔ وہ یہ کیوں بھول جاتی ہیں کہ وہ میری بھی تو ماں ہیں۔ وہ مجھے رنجن کی خاطر نظر انداز کرتی ہیں۔ اسی کی وجہ سے میرے لیے دشواریاں ہیں۔ میں اُس سے نفرت کرتا ہوں۔

روی کی اپنے ماں باپ سے ناراضگی بڑھتی ہی گئی۔ اور وہ ششماہی امتحان میں اپنی صلاحیت کو برقرار نہیں رکھ پایا۔ کلاس میں اُس کی دسویں پوزیشن ہونے کی وجہ سے اُس کے ٹیچر اُس سے ناخوش تھے۔ لیکن روی دل ہی دل میں

خوش تھا۔ اب پپّا اور اماں، اُس کی بھی خوشامد کریں گے کہ بیٹا پڑھ لو۔ تھوڑا اُسے ڈر بھی تھا کہ پپّا اُس کی پٹائی بھی کر سکتے ہیں۔ کوئی بات نہیں اماں اُس کے لیے اُس کی پسند کا کھانا بنائیں گی اور کھانے کے لیے خوشامد کریں گی۔

اُس نے اپنا رپورٹ کارڈ گھر میں لا کر دیا اور پہلے ہی اگلے مزیدار لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن افسوس۔ گھر میں کوئی طوفان نہ برپا ہوا۔ ماں باپ نے معمولی طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ "اب جب کہ ہم خوش تھے کہ رنجن اس مرتبہ تمام مضامین میں پاس ہو گیا تھا، تم نے ہمیں یہ رپورٹ لا کر دی ہے"۔ کیا ہم کبھی بھی تم دونوں سے خوش نہیں ہو سکتے؟"

پھر وہی رنجن! روی نے غصّے سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ "آج بھی میرے رنجن کے مقابلے میں کہیں اچھے نمبر ہیں۔ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

"مقابلہ کرنا بند کرو" اُس کے پپّا چلائے۔

روی اب غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اُس نے مختلف طریقوں سے اپنے والدین کی توجہ حاصل کرنا چاہی۔ اُس نے آخر کار فیصلہ کر لیا۔ میں بھی رنجن کی طرح فیل ہو جاؤں گا۔ اور پھر دوسری مرتبہ پاس ہو جاؤں گا۔ تب یہ لوگ مجھے بھی پیار کریں گے اور میری تعریف بھی کریں گے۔

روی کو اپنے اِس فیصلے پر چلنے میں بہت دشواری ہوئی۔ وہ پڑھنے کا شوقین تھا وہ کلاس میں چاہتے ہوئے بھی لاپرواہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا ہوم ورک کیے بغیر کبھی بھی اسکول نہیں جاتا تھا۔

لیکن وہ اپنے ماں باپ کا پیار پانے کے لیے تڑپ رہا تھا جیسا کہ وہ رنجن پر نچھاور کیا کرتے تھے۔ اور اُس کو حاصل کرنے کا تنہا راستہ فیل ہو جانا تھا۔ کیا وہ ایسا کر سکتا تھا؟ وہ اندر ہی اندر اِس مشکل سے دوچار تھا۔ روی کی حالت دن بہ دن خراب ہونے لگی۔

اُس کے ماں باپ کو یہ یقین تھا کہ روی اپنے بارے میں بخوبی سوچ سکتا ہے اور اس لیے انھیں کمزور بچے، رنجن کی طرف زیادہ توجہ دینا چاہیے۔ وہ رنجن کو کامیاب بنانے میں اس قدر کھو چکے تھے کہ وہ یہ بھول ہی گئے کہ روی اُن کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کس قدر بے قرار ہے۔

مڈ ٹرم ٹیسٹ شروع ہو چکے تھے۔ روی نے اپنی خواہش کے برخلاف بھی پڑھنا جاری رکھا۔ کیوں کہ وہ ابھی بھی فیل ہونا چاہتا تھا۔

اُس نے میتھمیٹکس کے پیپر پر نظر ڈالی، وہ سب کچھ جانتا تھا۔ اُس کے اندر ایک عجیب قسم کی کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنا ایک بھی سوال غلط حل کر دے؟ لیکن اگر وہ سب کچھ صحیح کر دیتا ہے تو اس کے والدین اُس کا تو وجود ہی شاید بھول جائیں گے۔

اُس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں، وہ شرمسار تھا۔ اُس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھ ڈالا اُس کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل

گئی۔ اِس سے پہلے کہ وہ اپنے اوپر قابو پاتا وہ بے حال ہو کر رونے لگا۔

اُس کے میتھمیٹکس کے ٹیچر اُس کے پاس آئے، وہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا معاملہ ہے؟ "تم ٹھیک تو ہو"۔

روی بُری طرح رو رہا تھا۔ وہ جواب بھی نہ دے سکا۔ وہ بہت عرصے سے اپنے دُکھ کو تنہا برداشت کر رہا تھا۔

کلاس کے تمام بچے، اپنے ٹیچر کے سب سے چہیتے شاگرد کو روتا دیکھ رہے تھے جو لکھنے کے بجائے روتا ہی جا رہا تھا۔

ٹیچر نے بلکتے ہوئے بچے کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بھیج دیا۔

ہیڈ ماسٹر نے سب سے پہلے روی کو پانی دیا۔ جب روی خاموش ہوا تو انھوں نے پوچھا، کیا تم اِس لیے رو رہے تھے کیوں کہ تم سوالات کے جوابات نہیں جانتے؟

روی نے ہلکے سے جواب دیا "میں ہر چیز جانتا ہوں، لیکن میں جواب دینا نہیں چاہتا"۔ "جواب نہیں دینا چاہتا؟ کیوں؟"

روی خاموش تھا، وہ کس طرح اپنی پریشانی بتائے اور اگر وہ بتا بھی دے تو کیا ہیڈ ماسٹر صاحب اُس کی مشکل سمجھ سکیں گے؟"

میتھمیٹکس کے ٹیچر نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے اُس کی بے حد تعریف کی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، انھوں نے روی کے پاپا کو اپنے دفتر میں بلالیا۔

یہ سوچ کر کہ ضرور مسئلہ رنجن کا ہی ہوگا، پاپا فوراً وقت ضائع کیے بنا پہنچ گئے۔ جب انھوں نے روی کو ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں دیکھا تو انھیں اپنی آنکھوں پر یقین بھی نہیں آیا۔

روی! تم نے کیا کیا؟

روی کی آواز جذبات سے رندھ گئی۔ اُس نے اپنا سَر دوسری طرف پھیر لیا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا "آپ کے بیٹے نے اچانک کلاس میں بجائے ٹیسٹ دینے کے بے تحاشا رونا شروع کر دیا۔ کیا آپ جانتے ہیں اس کو کیا تکلیف ہے"۔

پاپا بالکل ششدر کھڑے تھے۔ جناب یہ تو بہت اچھا بچہ ہے۔ یہ تو بغیر کہے پڑھتا ہے۔ ہمیں اُس کی طرف سے کبھی پریشانی نہیں ہوئی۔

اچانک روی پھٹ پڑا "میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے بھی پریشان ہوں۔ جب کبھی بھی رنجن فیل ہوا، اُس کو اور زیادہ پیار کیا گیا۔ میں نے سوچا، اگر میں فیل ہو گیا تو آپ مجھے بھی پیار کریں گے۔ ورنہ آپ کو میری ذرّہ برابر بھی پرواہ نہیں ہوگی۔ آپ مجھے پیار نہیں کرتے، آپ مجھے نہیں چاہتے۔ یہی وجہ تھی کہ میں فیل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن میں

فیل کیسے ہو سکتا تھا؟ مجھے تو ہر چیز آتی ہے!"

پاپا خوفزدہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پاپا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس بچے کے دماغ پر اس قدر بوجھ، واقعی بہت تکلیف دہ ہے۔ ہر بچہ اپنی جگہ اپنی اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے اِس بچے کو ایسا کیوں محسوس ہونے دیا کہ آپ دوسرے بچے کو زیادہ چاہتے ہیں؟

پاپا کو جواب دینے میں تھوڑی دیر لگی۔ پھر وہ بمشکل بولے "سَر روی اور رنجن جڑواں ہیں۔ پیدائش ہی سے رنجن کمزور رہا ہے۔ آج بھی وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ چھوٹا ہے۔ اس میں برداشت کی طاقت بالکل نہیں ہے۔ اُسے بہت جلدی ہر قسم کی بیماری لگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ اُس پر زیادہ دھیان دینے لگے۔ اور اِسی وجہ سے ہم اُس سے زیادہ لاڈ کرنے لگے اور روی کو سمجھنے لگے کہ اُس کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم اکثر سوچتے کہ وہ روی جیسا کیوں نہ بنا، مجھے غصہ آجاتا اور میں اُس کی پٹائی بھی کر دیتا۔"

"یہ تو بہت بُری بات ہے" ہیڈ ماسٹر صاحب درشت لہجے میں بولے۔

"اب ایسا کبھی نہیں ہوگا، واقعی ایسا کبھی نہیں ہونا چاہیے" پاپا نے وعدہ کیا۔

جس وقت بڑے لوگ یہ باتیں کر رہے تھے، روی کو چھ ماہ پہلا واقعہ یاد آرہا تھا جب رنجن بیمار پڑ گیا تھا۔ اُس کے ماں باپ رات دن اُس کے بستر کے پاس رہے اور انھوں نے باہر گھومنے جانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ اُسی وقت سے روی میں رنجن کے خلاف نفرت کا جذبہ ابھرا تھا۔ وہ غصّے سے بھر گیا تھا۔ جڑواں تو ایک روح دو قالب سمجھے جاتے ہیں، لیکن رنجن تو اِس کے برعکس تھا۔ اُس نے اُس کے ماں باپ کو، اُن کے پیار کو اُس سے دور کر دیا تھا۔ وہ کبھی بھی میرا دوست نہیں ہو سکتا۔

پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے، روی کو اپنی نفرت پر بھی افسوس ہونے لگا۔ اماں اور پاپا، رنجن کو اِس لیے زیادہ توجہ دیتے تھے کہ وہ بھی میری ہی طرح ہو سکے اُس نے سوچا۔ آخر میں نے اِس بات کو کیوں نہیں سمجھا؟ مجھے رنجن کا اچھا دوست ہو جانا چاہیے تھا۔ جب وہ بیمار تھا، میں اُس کا دل بہلا سکتا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کو بغیر رنجن کے تصور کیا، اُس کے چہرے پر مایوسی کے کالے سائے چھا گئے۔

وہ تکلیف سے چیخ پڑا۔ "نہیں ایسا نہیں ہو سکتا"

اُس کے پاپا اور ہیڈ ماسٹر صاحب نے اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"پاپا، روی جھجکتے ہوئے بولا، مجھے بے حد افسوس ہے، میں اتنا خود غرض کیسے ہو گیا۔ آج سے رنجن کی دیکھ بھال میں، میں آپ کی مدد کروں گا۔

اُس کے پاپا کا چہرہ خوشی اور اطمینان سے کھل اُٹھا۔ کیوں کہ وہ بحران جس نے پورے گھر کی خوشی اور امن کو داؤ پر لگا دیا تھا، بغیر کسی نقصان کے گذر گیا۔

روی ہیڈ ماسٹر صاحب کی طرف مڑا اور کہا "سر اگلے سال سے کیا آپ مہربانی فرما کر ہم دونوں کو ایک ہی کلاس میں رکھ سکیں گے؟ اس طرح میں پڑھائی میں رنجن کی مدد کر سکوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے اثبات میں سَر ہلایا لیکن ساتھ میں تنبیہ بھی کی کہ وہ اپنی پڑھائی سے ہرگز غافل نہ ہو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ میں تمہارا آج کا امتحان کسی اور دن لے لوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، پاپا اور اُن کا بیٹا اطمینان سے باہر نکل گئے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اُن کے اطمینان کو دیکھ کر مسکرائے۔
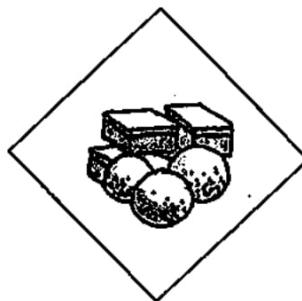
خوشی کی انتہا

نیلا سبراعظیم

وویک اسکول سے آہستہ آہستہ گھر کی جانب چل پڑا۔ اُسے اسکول ہی میں دیر ہو گئی تھی کیوں کہ وہ کرکٹ میچ دیکھنے کے لیے رُک گیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ اُس کی ممی اُس کے لیے بے حد پریشان ہوں گی اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ آج اُسے ڈانٹیں گی بھی ضرور کیوں کہ اُس نے اپنے دوستوں ہی سے کیوں نہ کہلا دیا تھا کہ وہ دیر سے آئے گا۔ لیکن گھر پر تو بالکل غیر متوقع معاملہ تھا۔

لوگوں کی بھیڑ تھی، زیادہ تر عورتیں اور بچے، اُس کے اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے کے پاس جہاں وہ رہتا تھا، جمع تھے۔ وہ حیران تھا کہ وہاں کیا ہو گیا تھا۔ وویک کی نگاہیں اُس کی ممی پر پڑیں۔ وہ اپنی ساڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ وہ ڈر گیا جانے کیا ہو گیا تھا، اُس کی پریشانی بڑھ رہی تھی، وہ بمشکل اپنی ممی کے پاس پہنچ سکا۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں امّاں؟" اُس نے پریشانی سے پوچھا، وہ خود کو گنا ہگار سمجھ رہا تھا۔

"اوہ، وویک، تمھیں دیکھ کر کس قدر اطمینان ہوا ہے، اُن کا چہرہ مسکرانے لگا۔

"اماں، پریشان نہ ہوں، اور یہ بتائیں کہ ہوا کیا ہے؟" وویک نے سوال دہرایا۔

اُسے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ممی، اُس کے دیر سے آنے کو بھول چکی ہیں۔

میں لیٹر بکس دیکھنے کے لیے نیچے آئی تھی اور اپنے فلیٹ کا سامنے والا دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی۔ لیکن تیز ہوا سے دروازہ بند ہو گیا اور اب یہ لاک ہو گیا ہے۔ مسز سری نواس نے پورا قصہ سنایا۔ میں نے کئی مرتبہ گھنٹی بھی بجائی، لیکن کیوں کہ تمہارے ناناجی کافی بہرے ہیں، شاید وہ سُن نہیں سکے۔

"اماں، آپ نے اپنی چابی سے کیوں نہ کھول لیا جو عام طور پر آپ اپنے پاس رکھتی ہیں" وویک نے انھیں یاد دلایا۔

مسز سری نواس نے لاچاری سے اُس کی طرف دیکھا۔

"میں منہ دھونے کے لیے غسل خانہ گئی تھی اور چابی وہیں بھول آئی"۔

"تو وہ آپ پاپا سے بھی مدد نہیں لے سکتی تھیں کیوں کہ دہلی سے تو وہ کل ہی آئیں گے۔"

وویک نے ہلکی سی سیٹی بجاتے ہوئے پوچھا، اماں، مجھے بتائیں، کتنی دیر سے یہ سب چل رہا ہے؟"

تقریباً آدھے گھنٹے سے۔ مجھے اِس لیے زیادہ فکر ہے کہ ناناجی کہیں سو نہ گئے ہوں۔ میں نے جب انھیں دیکھا تھا وہ ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ اُس کی ممی کی پریشانی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

وویک چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا۔ اُس نے بھیڑ میں ایک چہرے کو تلاش کیا اور اپنی ممی سے بولا۔

"اماں، چوکیدار کہاں ہے؟، اُس نے زور سے کہا۔

"وہ اِس وقت دوپہر کی چھٹی پر ہے"، مسز سری نواس نے اپنے لڑکے کو یاد دلایا۔

وویک نے اپنا اسکول بیگ زمین پر رکھ دیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آم کے پیڑ کی ایک ٹہنی جو کہ برابر والے گھر میں کھڑا تھا، تقریباً اُس کے ڈرائنگ روم وڈائننگ روم کی کھڑکی تک پہنچ گئی تھی۔

"میں اِس پر چڑھ کر دیکھوں گا کہ ناناجی کیا کر رہے ہیں۔ شاید اُن کو میں اپنی طرف متوجہ کر سکوں اور اس طرح دروازہ کھل سکے" وویک نے اپنے جوتے اتار دیے۔

دوسرے فلیٹوں سے عورتیں اُس کو آم کے درخت پر چڑھتا دیکھ کر اُس کی ہمت بڑھا رہی تھیں۔ "بس وویک اتنا کافی ہے۔ اِس سے آگے مت جانا، کہیں ایسا نہ ہو تم گر جاؤ"۔

"اب ذرا دیکھو، کیا تمھیں نانا جی نظر آرہے ہیں؟ وہ کیا کر رہے ہیں؟"

نہیں وہ کہیں دکھائی نہیں پڑتے۔ شاید وہ کمرے میں سو رہے ہیں۔ میں تھوڑی دیر انتظار کروں گا۔ وِدیک نے جواب دیا اور درخت پر اپنے آپ کو، جس قدر ممکن ہو سکا، ٹھیک سے بٹھالیا۔

اُس کو بھوک لگنے لگی تھی، اُس کی جیب میں چاکلیٹ بار موجود تھا جو اُس نے اسکول سے گھر آتے وقت خریدا تھا۔ وِدیک نے کاغذ اتار پھینکا اور کھانے لگا۔

وہ چند لمحوں کے لیے منہ چلانا بھول گیا، جب اُس نے نانا جی کو دیکھا۔ وِدیک کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اُس نے نانا جی کو فرنٹ ڈور کے نزدیک دیکھا۔ انھوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کیا دروازہ مقفل تھا۔ اُس کے بعد انھوں نے اپنے ہاتھوں کو ملا اور مسکرا دیے اور پھر، کچن میں جا کر غائب ہو گئے۔

وہ وہاں کیا کر رہے ہوں گے؟ وِدیک نے سوچا، اور پھر اُن کا انتظار کرنے لگا۔

چند منٹ بعد نانا جی پھر سامنے آگئے۔ اُن کے ہاتھ میں مٹھائی سے بھری ایک پلیٹ تھی۔ وِدیک تھوڑی دیر کے لیے ہکا بکا رہ گیا۔ نانا جی وہ مٹھائیاں کھا رہے تھے جو اُس کی ماں نے اُس کی برتھ ڈے پارٹی کے لیے بنائی تھیں جو شام کو ہونے والی تھی۔

ڈاکٹر نے نانا جی کو چند مہینوں کے لیے مٹھائی کھانے سے منع کیا تھا کیوں کہ اُن کا بلڈ شوگر کچھ بڑھا ہوا تھا اور اِس کو کنٹرول کرنا ضروری تھا۔ لیکن اِس وقت وہ مٹھائی کھا رہے تھے، افسوس، چوہا مزے اُڑاتا گھومتا ہے جب بلی دور ہوتی ہے۔ وِدیک خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے آپ پر مشکل سے قابو پا رہا تھا کیوں کہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ نیچے کھڑی بھیڑ اُس پر پوری طرح نظر رکھے ہوئے ہے۔

وِدیک کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، وہ کیسے اپنی ممی کو بتائے کہ اُس نے نانا جی کو دیکھ لیا تھا اور وہ کسی طرح بھی نانا جی کو روک نہیں سکتا تھا۔

اُسے کتنے ہی موقع یاد تھے جب نانا جی اُس کے ایک اچھے ساتھی بنے تھے اور انھوں نے کتنی بار والدین کی ڈانٹ سے بچالیا تھا۔ اُسے یاد ہے جب وِدیک اور اُس کے ماں باپ چند سال پہلے نانا جی کے آبائی گھر گئے تھے۔ وِدیک اور نانا جی ایک دن پانی میں شرابور گھر لوٹے۔ اُس کی ماں سے کہا کہ اصل میں اِس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہے کیوں کہ وہ وِدیک کو دریا کے کنارے اپنے چھپنے کی جگہ دکھانا چاہتے تھے۔

ایک اور مرتبہ وِدیک نے نانا جی سے مدد لی جو کہ نانی جی کے گذرنے کے بعد آئی گھر یک جانے پر انھیں کے ساتھ رہ

رہے تھے۔ ششماہی امتحان میں میتھمیٹکس میں اُس کے خراب نمبر آئے تھے۔

"پپّا اور ممّاں تو آسمان سَر پر اٹھالیں گے، مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے"۔ وِویک کو یاد آیا، اُس نے ناناجی سے یہی کہا تھا۔

پرواہ نہ کرو! میں سنبھال لوں گا۔ ناناجی نے پریشان بچے کو اطمینان دلایا۔

کھانا کھانے کے بعد انھوں نے اپنی لڑکی اور داماد کو بلایا اور کہا وہ بغیر کام کے بور ہوگئے ہیں اور آج سے وِویک کا ہوم ورک خود دیکھیں گے۔

وہ میتھمیٹکس میں کمزور ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ فائنل ایگزام میں اُس کے پورے نمبر آئیں۔ اگر اس مرتبہ اُس کے اچھے نمبر نہ آئے ہوں تو مجھے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔ ناناجی نے اپنی رائے دے دی۔

اس طرح وِویک کو اپنی رپورٹ بک دکھانے کا اشارہ مل گیا۔ وہ ناناجی کا شکر گزار تھا۔ انھوں نے، تنبیہہ کرتے ہوئے اُس کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ اُس کے والدین نے آگے اچھا کام کرنے کی ہدایت کی۔

اس وقت ناناجی کو مزے لینے دو، وِویک نے سوچا۔ اُس نے ایسا تاثر دیا جیسے کہ اُس نے کچھ بھی نہ دیکھا ہو جو کہ وہ اپنی ممی کو بتائے اور اپنی چاکلیٹ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وِویک نے دیکھا۔ ناناجی کے چہرے پر برفی کھاتے وقت ایک عجیب سی خوشی اور اطمینان تھا۔

اچانک ناناجی کی نظر وِویک پر پڑ گئی جو کہ کھڑکی سے اندر دیکھ رہا تھا۔ اُن کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں ہوگئے۔ انھوں نے خاموش رہنے کے لیے اپنے ہونٹوں پر اپنی اُنگلی رکھ دی۔ وِویک نے سَر ہلا کر اُن کی ہاں میں ہاں ملائی اور ناناجی کو اطمینان دلایا جب اُس نے ناناجی کی آنکھوں میں منّت دیکھی۔ ناناجی کو کھاتے دیکھ کر اُس کے منہ میں پانی آگیا۔

اُس کے بعد ناناجی کھڑکی کے پاس آئے اور ہلکے سے بولے۔ "میں اِس پلیٹ کو اچھی طرح دھو کر صاف کر دوں گا، اِس سے پہلے کہ تمہاری ماں مجھے پکڑلے۔ اُس کو کچھ پتہ نہ چل سکے گا کیوں کہ میں نے پہلے ہی سے اچھی صفائی کر دی ہے۔ تھوڑی سی دیر اور پلیز وِویک"۔

"وِویک کیا تم نے ناناجی کو دیکھا؟" اُس کی ماں نے پیچھے سے سوال کیا۔

"نہیں...... ہاں۔ اب وہ اپنے کمرے کی طرف آرہے ہیں۔ میں اُن کو متوجہ کرنے کی کوشش کروں گا"۔ وِویک نے ناناجی کو دیکھ کر کہا جو کہ کچن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے باہر آرہے تھے۔ اُس نے آس پاس کی کچھ ڈالیاں توڑیں۔ ناناجی اُس کو یہ کرتا دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ وِویک ٹہنیوں کو بار بار ہلانے لگا اور یہ دکھانے لگا جیسے وہ ناناجی کی توجہ حاصل

کرنے میں ناکام رہا ہے۔ پھر ودیک نے ایک چھوٹا سا ہرا آم توڑا اور نشانہ باندھا۔

ناناجی نے مجھے دیکھ لیا ہے۔ میں اُن کو احساس دلاؤں گا کہ فرنٹ ڈور لاک ہو گیا ہے اور یہ کہ وہ اس کو کھول دیں۔ ودیک نے ضروری اشارے کیے تا کہ وہ ناناجی کو بتا سکے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

ناناجی، ودیک کی کوششوں کو بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ کمرے سے دروازہ کھولنے باہر نکل آئے۔

مسز سری نواس تیزی سے زینہ پر چڑھ گئیں اور اپنے پاپا کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ انھوں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ وہ ودیک کی برتھ ڈے پارٹی کے بارے میں سوچ کر خوش ہو رہے تھے۔

"مجھے خوشی ہے سب کچھ ٹھیک رہا"۔ مسز سری نواس بولیں۔ ودیک نے ناناجی کی بات مسکراتے ہوئے سنی۔

میں بھی بہت خوش ہوں۔ ہم سب اب آج کی پارٹی کا مزہ لیں گے، کیوں ناناجی!"

پارٹی میں برتھ ڈے کیک کا پہلا ٹکڑا ناناجی کو پیش کیا۔

"یہ خاص طور پر آپ کے لیے ہے، ناناجی، میرے کیک کا چھوٹا سا ٹکڑا آپ کو یہ کھانا ہی پڑے گا۔ میں آپ کی "نا" ہرگز قبول نہیں کروں گا"۔ ودیک نے ہنستے ہوئے کہا۔

شکریہ، ودیک، خدا تمھیں اپنی رحمتوں سے نوازے، ناناجی نے دعائیں دیں"۔

ودیک کو یہ جان کر اور بھی اچھا لگا کہ ناناجی پر چوری کی دعوت کے بُرے اثرات نہیں پڑے تھے۔

اگلے ہی دن، ناناجی نے اقوال کی ایک کتاب میں جو کہ وہ پڑھ رہے تھے۔ اُس کو ایک حکایت کی طرف اشارہ کیا جو اس طرح تھی۔

زندگی سے بھرپور ایک لمحہ، تمام عمر کی زندگی سے بہتر ہے۔

بالکل ٹھیک ایک بھرپور گھنٹہ ناناجی کے لیے زندگی کا سب سے اچھا لمحہ تھا۔

گھر جو غائب ہو گیا

سروجنی چوپڑہ

ٹھاکر رام ہری سنگھ ایک کھلے میدان کے کنارے کھڑے تھے۔ اُن کے سامنے کوڑے، کرکٹ اور جھاڑیوں کا ڈھیر تھا۔ اِدھر اُدھر اینٹ کے روڑے بکھرے پڑے تھے۔ اُن کی آنکھوں کے سامنے کوئی بھی جانی پہچانی چیز نہیں تھی۔ انھوں نے اِس میدان کے چاروں طرف گھومنے کا ارادہ کیا۔ وہ یہاں جو کبھی کچھ تھا، اُس کو اپنی یادوں میں واپس لانا چاہتے تھے۔

وہ تھوڑا ہی آگے بڑھے تھے، کہ اُن کا پیر ایک گڑھے میں جا پڑا۔ اُن کے بچپن میں یہاں ایک زبردست آم کا پیڑ ہوا کرتا تھا۔ کتنی ہی بار وہ اپنے ماں باپ کے غصے سے بچنے کے لیے یہاں چھپ جایا کرتے تھے۔ تھوڑا اور آگے بڑھنے پر کچھ اور یادیں اُن کے ذہن کو جھنجھوڑ گئیں۔ یہاں پیڑوں کی جڑیں اور ایک ٹوٹا، اُجڑا ہوا پیڑ ہوا کرتا تھا۔

وہ چلتے چلتے بیچ ہی میں رُک گئے، فائدہ بھی کیا تھا۔ چکّر لگانے سے وہ سب تو واپس نہیں آئے گا جو کہ کبھی یہاں تھا۔ بلکہ شاید اس کے برعکس ہو وہ پوری طرح غم میں ڈوب سکتے تھے یا غم اور محرومیت کے احساس سے وہ نڈھال ہو کر رو پڑتے۔ انھیں اُن الفاظ کی تلاش تھی جن سے کہ وہ اپنے گھر والوں کو بتا سکیں کہ انھوں نے کیا دیکھا تھا۔ عملی ہونا ضروری تھا صرف بے حد جذباتی ہونا ہی کافی نہ تھا۔ وہ کیا قدم اُٹھا سکتے تھے اور کس کے خلاف؟ وہ کہاں سے اپنا کام شروع کریں؟

انھوں نے اپنے قدموں کو پھر تلاش کیا،افسوس،وہ اپنے آپ سے بولے۔شروع میں ہلکے سے اور پھر پورے یقین کے ساتھ۔"ہاں، گھر وہاں سے جاچکا ہے۔گھر دور جاچکا ہے"۔ انھوں نے اپنے آپ کو زور سے ہلایا جیسے کہ کوئی بُرا خواب دیکھا ہو۔

"یہ سچ ہے،اب وہ وہاں نہیں ہے"۔

یہ سب آج سے تقریباً بیس سال پہلے شروع ہوا تھا۔وہ ٹھاکر فیملی کا سربراہ،ایک بڑی ملکیت کا وارث۔ٹھاکر بلیات کی سب سے اعلا فیملی تھی جو ایک بے حد مالدار اور زرخیز علاقہ تھا۔یہاں بڑے پیمانے پر فصلیں اگائی جاتی تھیں اور یہ فصلیں ٹھاکروں کو روپیہ فراہم کرتی تھیں۔پھر یہ روپیہ پیسہ،سونے کی اینٹوں میں تبدیل ہو جایا کرتا تھا اور اس کے بعد اِن اینٹوں کو حویلی میں بڑے مضبوط بکسوں میں رکھ دیا جاتا تھا۔کچے آموں سے بھری بوریاں، پکے سنتروں سے بھری ٹوکریاں اور سبزیاں،اِن سب چیزوں کے ڈھیر لگ جاتے تھے،اِس حد تک کے گھر کے کمرے بھی بھر جائیں۔

اِس گھر کا کوئی خاص نقشہ نہیں تھا سوائے اِس کے کہ یہ بے حد بڑا تھا۔جیسے جیسے ضرورت ہوتی گئی، کمروں میں اضافہ ہوتا گیا۔بیٹے کا پیدا ہونا یا کسی کی شادی ہونا،اِن اضافوں کی وجہ ہوا کرتی تھی۔کبھی کسی نے قرینے سے بنوانے پر دھیان ہی نہیں دیا۔اسی وجہ سے کچھ کمرے ضرورت سے زیادہ بڑے تو کچھ چھوٹے بغیر روشن دانوں کے۔انجام یہ کہ پورا گھر ایک بڑا محل بن چکا تھا جس میں جگہ جگہ مینار،دریچہ،کھلے لمبے چوڑے صحن اور چھوٹی چھوٹی منڈیریں، ملک کی پسند اور ضرورت کے مطابق بڑھ چکی تھیں۔اندر حویلی میں ہوا کام،رہنے والوں کی پسند اور امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

اِس گھر کے چاروں طرف بہت سے درخت تھے۔ہر خوشی کے موقعے پر کسی نہ کسی بہانے اِن درختوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔جیسے کے ہونا چاہیے تھا،یہ درخت بھی بے ترتیب لگا دیے گئے تھے اور اِن کو دیکھ کر جنگل کا سا احساس ہوتا تھا۔یہ تمام درخت زندگی سے بھرپور تھے۔نہ صرف مختلف قسم کی چڑیوں، پرندے بلکہ اور بہت سے چھوٹے موٹے جانوروں کے لیے بھی یہ ایک اچھی پناہ گاہ تھی۔دوپہر کے سناٹوں میں شریر بچے اکثر دیواروں پر چڑھ جاتے اور وہ سب شرارتیں کیا کرتے جو کہ تمام دنیا کے بچے کرتے ہیں۔باغ بھی ایک چہل پہل کا مقام بن گیا تھا جس طرح کہ خود حویلی تھی۔

آہستہ آہستہ بچے جوان ہونے لگے۔لڑکیوں کی شادی دوسرے بڑے گھرانوں میں ہو گئی اور اکلوتا بیٹا بہت مہنگے اسکولوں اور پھر کالجوں میں تعلیم کے لیے بھیجا گیا۔گرمیوں کی چھٹیاں پہاڑی مقامات پر گذرتیں اور جاڑے بڑے بڑے شہروں میں۔کئی کئی ہفتوں کے لیے حویلی میں سناٹا سا چھا جاتا۔

بڑے ہونے پر رام ہری کو گھر سے بہت دور کلکتہ میں ایک اچھی نوکری مل گئی۔ اُس کا بہت کم تعلیات آنا ہوتا۔ جب کبھی اُس کو پیسے کی ضرورت ہوتی وہ منگوا بھیجتا۔ اب کیوں کہ وہ تمام املاک کا سربراہ تھا وہ ان سب کی خود دیکھ بھال کرتا۔ اپنے بزرگوں کی زمینوں کی آمدنی کو بھی وہ مہارت سے نہیں دیکھ پاتا تھا۔ اُس نے ایک آسان راستہ نکال لیا۔ وہ اپنی زرخیز زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کو بیچنے پر راضی ہو گیا۔ اُس کو تیز قسم کی موٹر کاریں رکھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ گھومنا پھرنا اُس کا دوسرا شوق تھا اور اِن دونوں شوقوں کے لیے بہت زیادہ رقم کی ضرورت تھی اور اس طرح زمین بڑی تیزی سے بکنے لگی۔ وہ مشہور ہو گیا کہ وہ ٹھاکر جو ایک گانے کے لیے بھی اپنی زمین بیچ دیتا ہے۔ یاد ہے پیسے کی زمین بیچنے والے ٹھاکر صاحب۔

رام ہری کو اس طرح کی زندگی بہت پسند تھی۔ اُس نے اپنی گرتی اور سمٹتی ہوئی جاگیر کے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ کچھ دنوں بعد اُس کے پاس صرف ایک گھر بچا تھا، جو کہ ٹھاکر نواس کے نام سے مشہور تھا۔ اُس نے صرف اِس خیال سے اِس گھر کو نہیں بیچا کہ یہ گھر اُس کے گاؤں میں رہنے سہنے کے کام آئے گا۔ وہ اپنے خاص مہمانوں کی آؤ بھگت اِس گھر میں کر سکتا تھا۔

اِس موقعے پر تعلیات گاؤں کا ایک سرکاری کارندہ اُس سے ملنے کے لیے آیا۔ اُس کا نام سیوا سنگھ تھا۔ اُس کا گول سر تیل کی خوشبو سے بسا ہوا تھا رام ہری کے خوب صورت کلکتہ والے گھر میں اُس کو خوش آمدید نہیں کہا گیا۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ اُس نے اُن ناراض نظروں کی بھی پرواہ نہ کی جو اُس پر ڈالی گئی تھیں۔ پھر بھی وہ صبر کے ساتھ انتظار کرنے لگا۔ اُس کے پاس ایک بڑی اچھی تجویز تھی، اُس نے کہا۔ وہ نواس کو کرائے پر لینا چاہتا تھا۔ اُس نے بہت عجلت سے ایک ایسی رقم تجویز کر دی کہ ٹھاکر انکار نہ کر سکا۔ معاملہ طے پا گیا اور پیشگی رقم بھی پیش کر دی۔ نقد روپیہ کو دیکھ کر رام ہری کو فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی اور اس طرح سیوا رام داخل نواس ہو گیا۔

اِس رقم کو خاندان کی سیر و تفریح پر خرچ کر دیا گیا۔ کرایے کی دوسری قسط منی آرڈر سے وقت پر آگئی جس سے رام ہری کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس طرح بعد کی قسطیں بھی آنے لگیں۔ کبھی بھی کرایے دار کی طرف سے مرمت یا کسی اور وجہ سے رقم میں کٹوتی نہیں کی گئی۔

"اچھا آدمی ہے" رام ہری نے سوچا۔

لیکن ایک ماہ منی آرڈر نہیں آیا۔ اِس پر کسی نے توجہ بھی نہ کی۔ دوسرے ماہ بھی ایسا ہی ہوا اور پھر اِس طرح تیسرے اور چوتھے مہینے۔ پھر سلسلہ بڑھتا ہی گیا۔ باوجود مصروفیت رام ہری نے سیوا سنگھ کو ایک خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔

اُس نے خط میں زور دیا کہ حساب کو برابر کر لیا جائے۔

لیکن خط کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔

پھر ایک اور خط لکھا۔ خط کی زبان قدرے سخت تھی۔

اِس کا بھی کوئی جواب نہیں آیا۔

رجسٹرڈ لیٹر بھیجا۔ اُس کے بعد رجسٹرڈ اے۔ڈی۔

کوئی اثر نہیں ہوا۔

ٹھاکر کی بیوی نے شوہر کی جان کھانی شروع کر دی۔ کیوں کہ اس کی طرز زندگی صرف دفتر کے معاملات سے نپٹنا بن گئی تھی، اُس کو بیوی کا شور مچانا بُرا لگنے لگا۔ اُس سے اِس سلسلے میں فوراً ضروری قدم اُٹھانے کے لیے زور دیا گیا۔

لیکن تیار ہوتے ہوتے کئی سال گذر گئے۔

آخر کار وہ بے حد ناراض نہایات کے لیے روانہ ہو ہی گیا۔ وہ سیوا سنگھ کو ایک یادو سخت قسم کی خوراک دے گا اور اگر ضرورت ہوئی تو مکان بھی خالی کرالے گا۔ گرچہ یہ بہت بُرا ہوگا۔ لیکن اِس کے لیے وہی ذمہ دار ہے۔

رام ہری پاس کے اسٹیشن پر اُتر گیا۔ اُس نے ایک تانگہ لیا اور تانگے والے سے نہایات چلنے کے لیے کہا۔ وہ شخص مول بھاؤ پہلے ہی سے کر لینا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر چپ ہو رہا کہ یہ شہری بابو اس کے ایک پانچ روپیہ کا نوٹ ضرور دے دے گا۔ نہایات پہنچنے پر اُس نے ٹھاکروں والے انداز میں بہت اکڑ کر کہا۔

"ٹھاکر نواس چلو"۔

اُس نے ٹھاکر کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ تانگے والے نے، جو کہ ایک جوان آدمی تھا، اِس سے پہلے یہ نام نہیں سنا تھا۔ رام ہری اپنی یادداشت سے تانگے والے کو راستہ بتاتا رہا، پھر بھی وہ اعتماد سے بولا، سیوا سنگھ کا گھر۔

"سیوا سنگھ اب یہاں نہیں رہتا"۔

"کیا"

ہاں صاحب، جس زمانے میں میری بہن کی شادی ہوئی تھی، انھیں دنوں وہ یہاں سے چلا گیا تھا۔ "یہ کب کی بات ہے؟" جب ہوشیار سنگھ کی سب سے اچھی فصل ہوئی تھی"۔

"خاموش" ٹھاکر زور سے گرجا"۔

سیوا سنگھ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ کیسے چلا گیا......اس نے مجھے......باقی جملہ رام ہری کے خیالوں میں ہی گم ہو گیا۔

تانگے والے نے ذرا پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔ "اب کہاں جانا ہے؟"

"جہاں سیوا سنگھ رہتا تھا"۔ اس مکان پر وہ جو بھی کہلاتا ہو"۔

مکان......ارے نہیں......مکان......

مجھے وہاں لے چلو، ٹھاکر زور سے چلایا۔

زمین کے پاس پہنچتے ہی، رام ہری ایک دم تانگے سے باہر کود گیا، اترتے ہوئے جلدی میں کچھ پیسے رام ہری نے تانگے والے کی طرف پھینک دیے۔

وہ تیزی سے اس زمین کی طرف بڑھ گیا، جہاں کبھی ٹھاکر نواس ہوا کرتا تھا۔ وہاں خاک اور مٹی کے علاوہ کچھ نہ تھا، ہر طرف دھول اُڑاتی ہوئی ہوائیں۔

رام ہری تیزی سے آبادی کی طرف پلٹا۔ اُس نے اُن کار ندوں کی تلاش کی جو کسی بھی کام کے نہ تھے۔ اُس نے اُن بوڑھوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی جو حقہ پی رہے تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔

اُس نے جو کچھ سنا وہ سن کر حیران و ششدر رہ گیا۔

کافی سال پہلے جب سیوا سنگھ تبایات آیا تو اُس نے ہر جگہ یہ خبر پھیلا دی کہ اُس نے یہ مکان ٹھاکر جی سے خرید لیا ہے۔

پٹواری، جس کو خود یہ حیرانی تھی کہ اِس معاملے میں اُس کو اطلاع کیوں نہیں کی گئی۔ اس کو یہ بتایا گیا کہ ٹھاکر جی کاغذی کارروائی کے لیے خود آئیں گے۔

پٹواری رئیس لوگوں کے رہن سہن سے بخوبی واقف تھا، اِس لیے اُس نے بھی پرواہ نہ کی اور آہستہ آہستہ ذہن سے ڈھل گیا۔

اُس کے تھوڑے دنوں بعد، سیوا سنگھ نے حویلی کا فرنیچر اور دوسری چیزوں کو بازار میں فروخت کر دیا۔ اِس بیچ اُس نے کلکتہ والوں کی طرف پورا دھیان دیا جب مکان بالکل خالی اور ویران ہو گیا، سیوا سنگھ نے اعلان کیا کہ وہ یہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بڑی عمارت بنا رہا ہے۔ یہاں کے وہی لوگ جنہوں نے ٹھاکر نواس کے در و دیوار کو بنایا تھا، اب اِس کے گرانے میں مصروف ہو گئے تھے۔

آہستہ آہستہ، شاندار دروازے اور کھڑکیاں دوسرے گھروں کی زینت بننے لگے۔ حویلی کے جھاڑ فانوس دوسرے

امیر گھروں کی رونق بڑھانے لگے۔ اور جو چھوٹی موٹی سجاوٹ کی چیزیں تھیں اُن کو توڑ لیا گیا۔ سنگ مرمر کے بنے فرش اُکھاڑ لیے گئے۔ ٹائلیں اور بہترین قسم کی اینٹیں کسی جگہ منتقل کر دی گئیں اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کو ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا۔ تمام دیواریں غائب ہو گئیں۔ عمارت صرف بنیادوں تک محدود ہو گئی۔ اِن بنیادوں کو بھی خزانوں کی تلاش میں کھود دیا گیا۔ اب کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔

سیوا سنگھ کے بارے میں سب نے یہی سوچا کہ وہ اُس کی اپنی جائداد ہے۔

اور اب وہ وقت آ پہنچا تھا جب کلکتہ کرایہ نہ بھیجنا ٹھیک تھا۔

رام ہری نے سیوا سنگھ کی تلاش کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہا۔

لیکن کسی چھوٹے سے قصبے کی چھوٹی سی گلی میں، ایک پرانے جھاڑ فانوس کی روشنی میں ٹھاکر کی پسندیدہ آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سیوا سنگھ دنیا کی اِسی طرح کی ایک اور سیوا (خدمت) کی سوچ رہا ہے۔
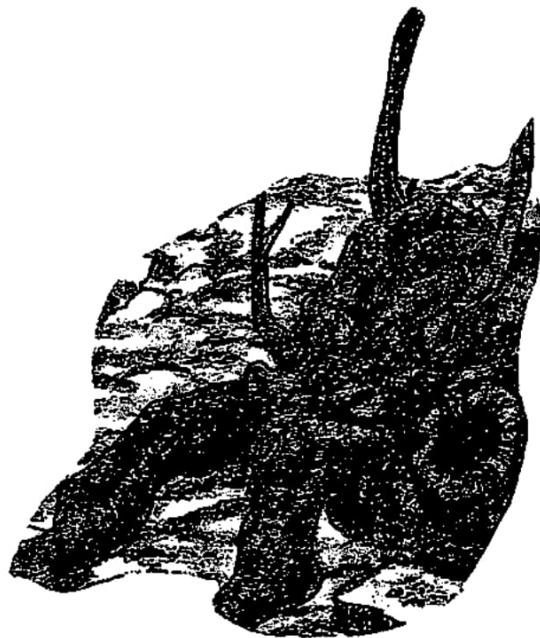
سب سے الگ

بِتھی تاوورا

"اسکول میں پہلا دن کیسا رہا؟" رات کے کھانے پر ماں نے ریما سے پوچھا۔

"او. کے۔ آج پڑھائی نہیں ہوئی۔ پورا دن یونہی گذر گیا" ریما نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری کلاس میں نئی لڑکیاں بھی آئی ہیں" باپ، مسٹر سین نے دریافت کیا۔

"صرف ایک......مالتی...... اور وہ بہت دل چسپ ہے" ریما نے سلاد لیتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" مسٹر سین نے پوچھا۔

"وہ اچھی طرح انگریزی نہیں بول سکتی۔ وہ کسی اور صوبے سے آئی ہے" ریما نے ملک کے دوسرے سرے کے ایک حصے کا نام لیتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

لیکن اس صوبے کے بچے عام طور پر تیز ہوتے ہیں، خاص طور پر میتھس میں" مسٹر سین نے ہلکے سے کہا۔

لیکن یہ لڑکی تو کسی طرح بھی تیز نہیں لگتی۔ سَر میں تیل، ماتھے پر بندی، لہجہ...... گوڈ مورننگ ٹیچر"۔ ریما نے نقل اتاری۔

اس کے ماں باپ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ریما اُن کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اس پر جان چھڑکتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی وہ ناقابل برداشت ہو جاتی تھی۔

"میں تم سے امید کرتا ہوں کہ تم اور تمہاری دوست مالتی کے لیے مشکلات پیدا نہیں کروگی"۔ مسٹر سین نے میز سے اُٹھتے ہوئے تاکید کی۔

لیکن ریما اور اُس کی ساتھیوں نے ایسا ہی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلی صبح، جیسے ہی مالتی کلاس روم میں داخل ہوئی۔ اُن سب نے ایک آواز میں زور سے کہا۔ "گوڈ مارننگ!"

بے چاری مالتی، وہ یہ سمجھ بھی نہ سکی کہ وہ سب لڑکیاں اُس کا مذاق بنا رہی تھیں۔

اُس نے مڑ کر اُن کی طرف دیکھا اور جواب دیا "گوڈ مارننگ"۔

شہناز نے مذاق اُڑاتے ہوئے پوچھا۔ "تم اپنے بالوں میں اتنا تیل کیوں لگاتی ہو"۔

مالتی کو تھوڑا بُرا لگا، لیکن اُس نے پلٹ کے جواب نہیں دیا۔

"اور اسکرٹ بھی اتنا لمبا"، کلیئر...... نے شوخی سے کہا۔

مالتی جواب دینے ہی والی تھی کہ ٹیچر آ گئیں۔ کلاس میں سب کو دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ جب بھی ٹیچر کوئی سوال کرتیں، مالتی فوراً اپنا ہاتھ اُٹھا دیتی۔

"ٹھیک، مالتی، تم جواب دو" ٹیچر نے حکم دیا۔

مالتی نے درست جواب دیا اور ٹیچر نے اُس کی تعریف میں سَر ہلایا۔

جب ریما نے گھر پر یہ سب سنایا، تو اُس کی ماں نے کہا "لگتا ہے لڑکی کافی ہوشیار ہے"۔

"کیا فائدہ؟" ریما نے حقارت سے کہا "اُس کی انگریزی جو اس قدر خراب ہے"۔

"تمہاری ہندی کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا جا سکتا ہے، مسٹر سین نے فوراً یاد دلایا۔ وہ ریما کی اِس عادت سے خاصے پریشان ہو چکے تھے۔

مسز سین کو بھی یہ سب پسند نہ تھا۔ اُس رات ریما کے ماں باپ نے اِس مسئلہ پر بات چیت کی۔

"ہم نے ریما کو ایک اچھے اسکول میں اِس لیے داخل کرایا تھا کہ وہ اچھی انسان اور پُر اعتماد ہو۔ لیکن مجھے ڈر ہے وہ تو خاصی گھمنڈی بنتی جا رہی ہے۔" مسٹر سین نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

اگلے ہی سنیچر کو انٹر ہاؤس گانے کا مقابلہ تھا۔ ریما جو کہ انگریزی گانوں کی کیٹیگری میں حصہ لے رہی تھی، فہرست میں ہندی گانے کی کیٹیگری میں مالتی کا نام دیکھ کر حیران رہ گئی۔ "تیل بھری چٹیا گاتی بھی ہے، اُس نے کلیئر کی طرف دیکھتے ہوئے چوٹ کی۔"

"تمہارا مطلب ہے، مینڈک کی طرح ٹرائے گی۔" کلیئر نے مذاق اُڑایا۔

لیکن اُن کی پیشگوئی جھوٹی ثابت ہوئی۔

مالتی نے بہت اچھا گایا۔ اُس کی آواز سریلی اور منجھی ہوئی تھی۔ ریما اور اُس کی ساتھیوں نے سوچا تھا کہ جب مالتی گائے گی وہ سب شور مچائیں گی۔ لیکن اُس کا گانا پوری خاموشی سے سنا گیا، وہ اُس کا مذاق اُڑانے کی ہمت بھی نہ کر سکیں۔

انھیں یقین تھا کہ اگر انھوں نے شور مچایا تو وہ پکڑی جائیں گی۔ جیسے ہی مالتی گانا گا چکی، پرنسپل صاحب نے تالیوں کا آغاز کیا اور پھر ٹیچر اور سارے بچوں نے۔

مالتی کے پہلا انعام ملنے پر کسی کو بھی تعجب نہ تھا۔ ریما بھی کسی طرح اپنی کیٹیگری میں فرسٹ آگئی تھی، لیکن اُس کو مزہ نہیں آیا۔

جیسے جیسے سال ختم ہونے لگا، یہ سب پر واضح ہو چکا تھا کہ مالتی ایک ذہین بچی تھی۔ وہ بے حد محنتی، خاموش طبیعت اور ذہین تھی۔ کھیل کود میں بھی وہ آگے تھی۔ اُس کی سب سے زیادہ رغبت میتھس میں تھی۔ وہ ایک تیز ذہن کی مالک تھی البتہ سادگی پسند تھی۔ آہستہ آہستہ بہت سی لڑکیاں میتھس میں اُس کی مدد لینے لگیں۔ وہ فوراً اور بہت خوشی سے راضی ہو گئی۔ ٹیچر تو پہلے ہی دن سے اُس کی ذہانت اور اچھی عادت و اطوار کو پسند کرتی تھیں۔ اب کلاس کی اور بچیاں بھی اُس کی دوست بن گئی تھیں۔ لیکن ریما اور اُس کی ساتھیوں نے اُسے آج بھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ مالتی سے نفرت کرتی تھیں۔ وہ سب کی سب بے حد بختی تھیں اور مالتی اُن جیسی نہ تھی۔ جب کبھی انھیں موقع ملتا وہ اُس کا مذاق اُڑانے سے نہ چوکتیں خاص طور پر اُس کی انگریزی کا مذاق۔

مالتی کو اُن کے اِس سلوک پر افسوس ہوتا۔ ایک روز تو وہ روتے روتے رہ گئی۔ جب ریما نے اُس کے آسک کے بجائے آسکس (Asks) کے بجائے "آکس" کا مذاق اڑایا۔

ہکلاتی آواز میں مالتی نے کہا "میں جانتی ہوں میری انگریزی بہت کمزور ہے "اور تمہاری بہت اچھی۔ کیا تم میری انگریزی بہتر کرنے میں میری مدد کرو گی"۔

"نہیں میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گی"۔ ریما نے بڑے اُکھڑے لہجے میں کہا۔ "درست انگریزی بولنا تم دیہاتیوں کے بس کی بات نہیں"۔

مالتی کا چہرہ غصّے اور افسوس سے لال ہو گیا، وہ جواب دینا چاہتی تھی، لیکن اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، وہ کیا کہے، وہ روتی ہوئی وہاں سے بھاگ گئی۔

"ریما، یہ ناقابلِ برداشت ہے" شہناز نے کہا۔

"بالکل"، نیہا اور کلیئر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

ریما کو زبردست جھٹکا لگا، اُس کی اپنی دوست اُس کے خلاف ہو گئی تھیں۔

وہ وہاں سے تیزی سے چلی گئی۔

مسز سین نے دوپہر کے کھانے پر ریما کو کچھ بجھا بجھا سا پایا، لیکن انھوں نے ریما سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ریما جانتی

تھی کہ اُس نے بد تمیزی کی تھی، لیکن وہ کسی بھی قیمت پر اپنی غلطی تسلیم نہیں کر سکتی تھی، حتیٰ کہ اپنے آپ سے بھی نہیں۔

اگلی صبح جب وہ سو کر اُٹھی اُس کا سَر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ پچھلی رات وہ بمشکل سو پائی تھی۔ لیکن اُس کی ممی کا کچھ اور ہی خیال تھا۔

"ریما، تمہارا چہرہ کیوں اس قدر اُترا ہوا ہے، تم ٹھیک تو ہو؟" انھوں نے پوچھا، ریما کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے، وہ اُچھل پڑیں۔ "ارے تمہیں تو تیز بخار ہے۔ جاؤ تم آرام کرو۔ آج اسکول کی چھٹی کرو"، انھوں نے حکم دیا۔

ریما کو زیادہ فکر نہ تھی، لیکن وہ کمزوری ضرور محسوس کر رہی تھی۔ اگلے روز بھی اُس کی طبیعت بہتر نہ ہوئی۔ ڈاکٹر نے کم از کم ایک ہفتے کے لیے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔

ریما پریشان تھی۔ ٹرم ٹیسٹ آنے والے پیر سے شروع ہونے والے تھے۔ امتحانوں سے ہفتہ بھر پہلے اسکول نہ جانے کا مطلب پڑھائی کا زبردست نقصان تھا۔ کلاس میں اہم سوال و جواب پر بحث ہوتی ہے۔ اور وہ ان سب سے محروم ہو جائے گی۔

اوہ، ممی، میں کیسے کروں گی، وہ روہانسی ہو گئی۔

"تم گھر پر جس قدر کر سکتی ہو اپنی تیاری کرو۔ جب تمہاری دوست تم سے ملنے آئیں تم اُن سے معلوم کر سکتی ہو کہ کلاس میں کیا کام کرایا گیا تھا" ماں نے جواب دیا۔

ریما کی کوئی بھی دوست اُس سے ملنے نہیں آئی۔

ریما کی ممی کو بہت غصہ آیا۔ کس طرح کی موسمی، اچھے وقت کی دوست ہیں، انھوں نے اپنے شوہر سے کہا۔ کم از کم وہ دیکھنے تو آ ہی سکتی تھیں کہ ریما کس حال میں ہے۔

ریما کو تسلی دیتے ہوئے، انھوں نے کہا۔ شاید وہ امتحانوں کی تیاری میں مصروف ہوں گی، وہ خیریت تو معلوم کر ہی سکتی تھیں، ریما نے شکایتاً کہا۔

مسز سین کے پاس اُس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اُسی دوپہر، ریما سے ملنے کچھ لوگ آئے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی جب ممی اُس کی مہمانوں کو اُس کے کمرے میں لائیں ان میں مالتی تھی اور اُس کے ساتھ، ایک پُر وقار عورت شاید، اُس کی ماں ہی ہوں گی، کیوں کہ مالتی میں اُن کی بے حد شباہت تھی۔

"ہیلو، ریما، مجھے معلوم ہوا تم بیمار ہو۔ اب طبیعت کیسی ہے؟" مالتی نے معلوم کیا۔

ریما کو کوئی جواب نہ بن پڑا وہ بے حد مشکور تھی ساتھ ساتھ اُس کو اپنے کیے پر افسوس تھا اور تعجب بھی۔

مسز سین، ریما کا پوری طرح جائزہ لے رہی تھیں۔ انھیں اپنی بیٹی کی یہ حالت دیکھ کر اطمینان ہوا۔

یہ بہت اچھا ہوا، انھوں نے سوچا، چلو ہماری ریما کو یہ احساس تو ہوگا۔ کہ دوستی، اچھے اسٹائل کے کپڑوں اور لچھے دار بات چیت سے کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔

یہ دیکھ کر ریما خاموش تھی، مالتی کی ممی نے کہا، "شاید تم کو یہ فکر ہوگی کہ تم نے کورس دہرانے والے ہفتہ کو مس کر دیا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔ مالتی تمھاری مدد کر سکتی ہے۔"

"کیوں نہیں" مالتی نے خوشی سے کہا۔ "اور ہاں تم انگریزی میں میری مدد کر سکتی ہو"۔

ریما نے شرم سے اپنا سَر ہلایا۔ "شکریہ مالتی، تم بہت مہربان لڑکی ہو۔" وہ اُٹھ گئی اور مالتی کو گلے سے لگالیا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے، میں نے تم سے اس قدر بدتمیزی کی" وہ آہستہ سے بولی۔

"بھول جاؤ" میں پہلے ہی بھلا چکی ہوں، ریما کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے، مالتی بولی۔

دونوں ماؤں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکرادیں۔

نانی کا فٹ بال میچ
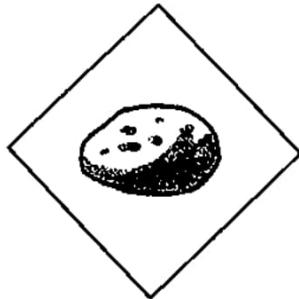
سدرشن کمار بھاٹیہ

"دادا جی، مجھے کوئی کہانی سنایئے" سونو نے کہا۔

رام ولاس کے لیے ہر شام کہانی سنانا، روزمرہ کا کام تھا۔ لیکن آج وہ اُداس تھا۔ اُس کی نانی (ماں کی ماں) ۶ر اپریل ۱۹۵۵ء کو گذر گئی تھی اور صرف ایک سال بعد، اسی روز اس کے نانا (ماں کے باپ) بھی خدا کو پیارے ہو گئے تھے۔ یہ کیسا عجیب اتفاق تھا کہ اسی روز اپریل میں ایک بار پھر ایسا حادثہ ہو گیا۔

"دادا جی، کیا آپ سو گئے؟ جاگیے اور مجھے کہانی سنایئے۔" سونو نے اپنی بات دہرائی۔

"اچھا سونو آج میں تمھیں ایک ایسی کہانی سناؤں گا کہ حقیقت بھی ہے اور دل چسپ بھی۔" یہ میری نانی کی کہانی ہے اور اس طرح رام ولاس شروع ہوا۔

نانی، پانچ فٹ سے ایک یا دو انچ کم ہی رہی ہو گی اور اس کے بال کالے کم اور سفید زیادہ تھے۔ کھڑا نقشہ چہ گورا بے حد صاف رنگ اور اس میں دو چمکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کے ہاتھ مضبوط تھے پانچ لڑکے اور لڑکیوں کی ماں جو سب کے

سب شادی شدہ تھے۔ نانی کا اپنے بچوں نواسا، نواسی اور پوتے پوتیوں پر بڑا رعب تھا۔ وہ ایک بڑے زمیندار کی بیوی تھی اور وہ ایسے گاؤں کی سب سے زیادہ باعزت عورت تھی جو ۲۰۰ گھروں پر مشتمل تھا۔

نانا چھ فٹ لمبے، گنجا سر، بھاری بھرکم، سفید مونچھوں والے شخص تھے۔

اپنی جوانی کے زمانے میں وہ ایک اچھے پہلوان تھے۔ انھوں نے عام طور پر اپنے تمام رقیبوں کو چت کیا تھا۔ نانا ایک مالدار ساہوکار تھے، ۱۵۰۰ ایکڑ زمین کے مالک۔ گاؤں کے چاروں طرف اُن کے باغات اور کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ نانا اپنی عقل، دانائی اور طاقت کے لیے مشہور تھے۔

"دادا جی، کیا آپ کی نانی میری دادی (باپ کی ماں) سے زیادہ خوب صورت تھیں اور کیا آپ کے نانا آپ سے زیادہ طاقت ور تھے" سونو نے بیچ میں سوال کر دیا۔

رام ولاس اپنے پوتے کے سوال پر ہنس دیا "ہاں، سونو میرے نانا بہت طاقت ور تھے لیکن تمہاری دادی میری نانی سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ میری نانی ایک ذہین عورت تھیں۔ میں تمھیں بتاؤں گا کہ میرے نانا نانی کے گھر کیا ہوا" اور وہ کہانی سنانے لگا۔

"سونو، ہمارا گاؤں لاہور سے تقریباً ۲۰۰ میل دور تھا اب پاکستان میں ہے۔ یہ جگہ ہمارے لیے جنت سے کم نہ تھی خاص طور سے اُن ۱۵ دِنوں کے لیے جب اسکول دسہرہ اور دیوالی کے موقعے پر بند ہوتا تھا۔ میری ماں، میری بہن دیپا اور میں کراچی میل سے ملتان کے لیے دوپہر بعد روانہ ہوئے۔ نانا جی کا تانگہ ہمیں اسٹیشن سے ہمارے گاؤں سلطان پور لے آیا۔

گاؤں کے باہر ایک بڑا تالاب اور اُس کے ایک کنارے پر پیپل کا پیڑ تھا۔ وہاں پر پورا گاؤں ہمیں لینے آتا تھا۔ بچے شور مچاتے، رامو آ گیا، رامو آ گیا۔ گاؤں کے بڑے میری ماں کو پیار کرتے اور دعائیں دیتے، "جیتی رہو، بیٹی خوش آمدید۔ تمھیں ایک بار ضرور آنا چاہیے"۔ پیپل کے پیڑ کے اُس طرف نانا کے دو بھائیوں کے مکان تھے۔ میری ماں کے چاچا اور چاچی ماں کو دعائیں دیتے اور ہم بچوں کو پیار کیا کرتے تھے۔ ہم نانی کی بڑی حویلی میں ٹھہرتے جو کہ سلطان پور میں سب سے بڑا پکا مکان تھا۔ نانی ہماری پیشانیوں کو چومتیں اور کہتیں دِتیا، میں ہر وقت تمھیں یاد کرتی ہوں اور پھر ہماری طرف مڑ کر کہتیں رامو، جیتے رہو، پیاری دیپا تم کیسی ہو۔ کیا بتاؤں، اِس وقت ہمیں نانی اِس زمین

پر سب سے زیادہ مہربان پَری کی طرح نظر آتیں۔

"داداجی ذرا جلدی کریں، اب اصلی کہانی تو سنائیں" سونو بے صبری سے بولا۔

رام ولاس نے محسوس کیا کہ وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا، "بے صبری مت دکھاؤ" اُس نے اپنے پوتے کو ٹوکا۔ میں تمھیں ہر چیز تفصیل سے سنانا چاہتا ہوں تاکہ تم پوری طرح مزہ لو" اور وہ دوبارہ کہانی سنانے لگا۔

نانی کی حویلی بہت بڑی اور چوکور تھی۔ باہر کی طرف، شمال کی جانب کمرے تھے۔ دو باورچی خانے، ساتھ میں برتنوں کی کوٹھری، جلانے کی لکڑی کا اسٹور اور پوجا کے کمرے، مشرق اور مغرب کی جانب۔ جنوب کی طرف دو بڑے ہال مردانہ تھے جو ڈیوڑھی سے الگ الگ ہو گئے تھے اور وہیں سے اوپر جانے کا زینہ تھا۔

حویلی کے بیچوں بیچ ایک بڑا صحن، شاید ۵۰ فیٹ لمبا اور ۵۰ ہی فیٹ چوڑا تھا۔ پکا فرش جو کہ اناج کی صفائی، اور ایک جگہ ڈھیر کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ برابر کے ایک کمرے میں ناناجی ملنے جلنے والوں سے گپ شپ کیا کرتے تھے جو کہ حویلی کی شمالی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ ناناجی صرف رات کے کھانے کے لیے حویلی میں آیا کرتے تھے۔ اُن کا ناشتہ اور دوپہر کا کھانا اُن کو باہر والے کمرے ہی میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس طرح ہم سب، دو درجن سے زیادہ بھائی بہن اور گاؤں کے دوسرے لڑکے صحن کے بیچوں بیچ دھما چوکڑی مچائے رکھتے تھے۔ کبھی کبھی تو ہم وہاں فٹ بال بھی کھیل لیا کرتے تھے اور حد تو یہ کہ سائیکل بھی چلایا کرتے تھے۔ جیسے ہی سورج غروب ہونے لگتا ہم سب صاف ستھرے ہو کر رات کے کھانے کے لیے دوڑ پڑتے۔ یہ ناناجی کے رات کے کھانے کا وقت تھا۔

ناناجی کے کھانے سے پہلے، صحن کو اچھی طرح دھویا جاتا۔ میرے چاچاجی اور چاچیاں اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے بچوں کو سمیٹ کر اپنے اپنے کمروں میں گھس جاتے۔ ہمارے بستر نانی جی کے کمرے میں لگتے جہاں ہماری ماں ہمیں آرام سے سلا دیتی تھیں۔ نہ کسی قسم کا شور نہ شرابہ۔ صاف ستھرے صحن میں، سب لوگ ناناجی کے آنے کا دم سادھے ہوئے انتظار کرتے"۔

رام ولاس، یہ جاننے کے لیے کہ سونو کیا واقعی جاگ رہا ہے، لمحے بھر کے لیے رُکے لیکن سونو کو پوری طرح متوجہ پاکر، وہ پھر شروع ہو گئے۔ "میں وہ دن کیسے بھول سکتا ہوں جب کہ باہر والے کمرے میں، گپ شپ کے دوران، ناناجی اور شیرا نام کا پڑوسی گاؤں کا پہلوان ایک دوسرے سے جھگڑ پڑے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ دنگل میں وہ ایک

دوسرے کو دیکھ لیں گے۔ ناناجی اور شیرا فوراً اکھاڑے چل دیے جو کہ گاؤں کے بیچوں بیچ تھا۔ انھوں نے اپنے بدن پر تیل لگایا اور اکھاڑے کی مٹی اپنے جسموں پر رگڑی۔

ایک دم ہی وہ ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ دیر تک وہ دونوں زور آزمائی کرتے رہے، کبھی شیرا ناناجی پر چڑھ بیٹھتا اور کبھی ناناجی۔ اچانک ناناجی نے شیرا کو اُٹھالیا اور چند ہی لمحوں میں اُس کو زمین پر پٹک دیا۔ تماشائیوں نے ناناجی کی جیت پر خوشی منائی اور ناناجی نے جیت کی خوشی میں اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا"۔

واہ، سولو زور سے اُچھلا، دادا جی، آپ نے بھی تو خوشی سے چیخ ماردی ہوگی۔

"ہاں، کیوں نہیں، سولو، ارے میں تو خوشی سے ناچ رہا تھا۔ مجھے اپنے طاقتور ناناجی پر ناز تھا۔"

اسی شام، ناناجی جب رات کے کھانے کے لیے حویلی آئے، تو نانی جی کے ساتھ شاید انھیں زیادہ ہی اچھا لگا، جو کہ اکثر خاموش رہا کرتی تھیں۔ شاید اُس پورے دن میں انھوں نے ایک دوسرے سے بات کی ہو لیکن ہم کچھ نہ سُن سکے۔ کھانے کے بعد ناناجی اپنے باہر والے کمرے میں چلے گئے اور نانی جی ہر روز کی طرح ہمیں کہانی سنانے لگیں۔

"سولو، اب ذرا غور سے سنو" رام ولاس بولے۔ "یہ ایک سہانی شام تھی صحن خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ناناجی ہمیشہ کی طرح پورے رعب کے ساتھ آئے۔ میں نے اُن کی لمبی چوڑی شخصیت کو اندر آتے دیکھا۔ انھوں نے کسی چیز پر زور سے لات جمائی اور اُسی وقت ہمارے دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔ میں خوف سے لرز گیا۔ وہ زور سے دھاڑے "تم کتنے سارے لوگ ہو، پھر بھی اِس جگہ کی بخوبی دیکھ بھال نہیں کرسکتے"۔

"ناناجی کھانا کھاتے رہے اور نانی جی خاموش رہیں۔ میری ماں نے ہم کو لحاف میں دُبکا دیا۔ کیا کوئی طوفان آنے والا تھا، نہیں۔ سہانی شام اندھیرے میں ڈوب گئی۔ نانی خاموشی سے اندر آئیں اور ایک تازہ کہانی سنانے لگیں۔ شاید انھوں نے ہمارے سو جانے کے بعد ہی ساری رام کہانی میری ماں کو سنائی ہوگی۔

"اگلے دن کوئی خاص بات نہیں ہوئی سوائے اِس کے کہ ہم جلدی سے اپنے بستروں میں گھس گئے۔ صحن کو دھویا اور سکھایا گیا۔ نانی جی نے دو نوکروں کو بلایا اور آلوؤں کے دو بوروں کو صحن میں خالی کرنے کے لیے کہا، جن کو ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلانا تھا۔ اِس راز کو سمجھنے سے میں قاصر تھا۔

"میں ناناجی کا کھانے پر آنے کا انتظار کرنے لگا۔"
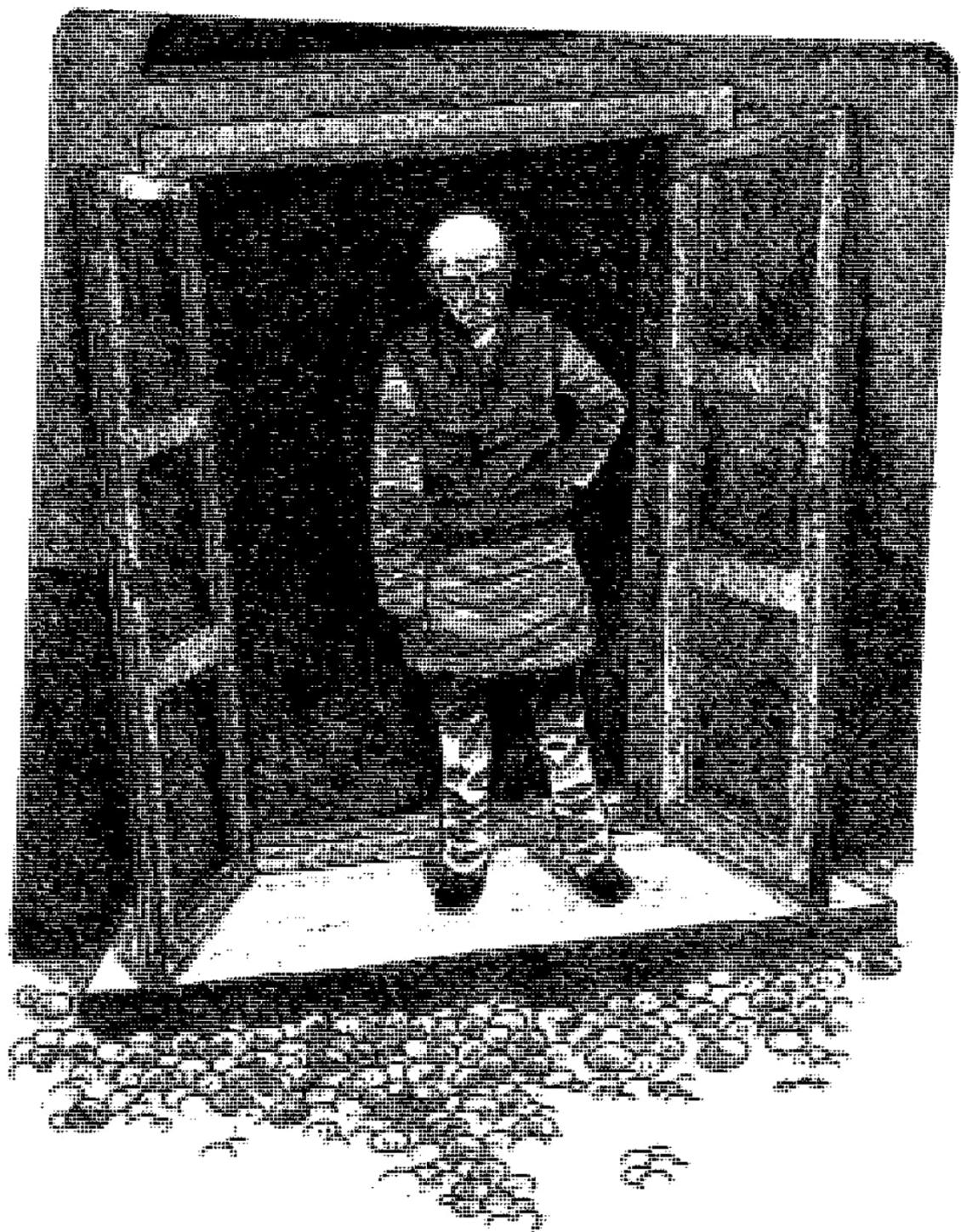
ہر طرف چاندنی پھیلی ہوئی تھی لیکن صحن آلوؤں سے بھرا پڑا تھا۔ نانا جی دروازے ہی میں جم کر رہ گئے تھے اور ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ تھوڑی دیر بعد، انھوں نے آواز لگائی، بیٹی اِدھر آؤ، شاید تمہاری ماں، کل شام کی بات پر مجھ سے ناراض ہے۔ مجھے آلوؤں کو ٹھوکر نہیں لگانی چاہیے تھی۔ بہر حال یہ گھر ہے، مجھے اُن کا خیال کرنا چاہیے تھا۔

"میری ماں، اپنے ابّا کو باورچی خانے میں لے گئیں جہاں نانی جی نے ہمیشہ کی طرح کھانا سجا رکھا تھا۔ میری ماں منانے کا گُر جانتی تھیں۔ جب نانا جی باہر والے کمرے کی طرف جا رہے تھے، اُس وقت اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، نانی جی بہت خوش تھیں۔

"سولو" میں نانی جی کی عقل مندیاں ہرگز نہیں بھول سکتا۔ وہ ہر جنگ جیتیں، چاہے حویلی کے اندر یا باہر، لیکن ہمیشہ خاموشی سے!"

کھو کر پایا

آرتی لتھر اپنٹو
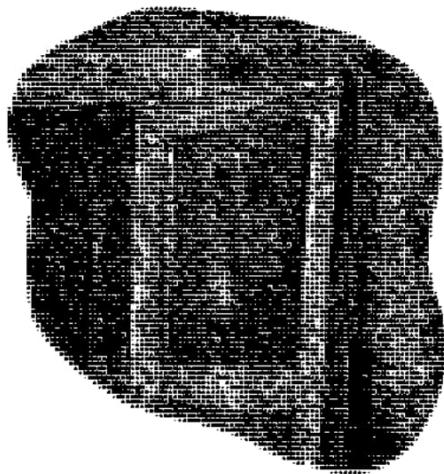
راجو کو زمین کھودنے کا بے حد شوق تھا، صبح ہو یا شام، یا چاہے رات ہی کیوں نہ ہو۔ سوائے دوپہر کے جب کہ اُس کی ماں اپنے بیٹے کو سخت دھوپ میں نکلنے نہیں دیتی تھی۔ کھودنے کے لیے راجو اپنی پرانی پنسلوں، کھرپے، ٹوٹی ہوئی ٹہنیوں اور ہر وہ چیز جو لمبی اور تیز ہو، کا استعمال کیا کرتا تھا۔

راجو مٹی کو محسوس کیا کرتا، خاص طور پر اس وقت جب وہ گیلی اور لیپ لپی ہوتی۔ اکثر اُسے مٹی میں، کیڑے، چیونٹیاں، گلے سڑے پتے، شیشے کے ٹکڑے، پتھر اور نہ جانے کیا کیا مل جاتے۔ اُسے یقین تھا کہ مٹی میں ایک پوری دنیا آباد ہے۔ وہ یہ سوچ کر اکثر پریشان ہو جاتا کہ مٹی میں چھپی دنیا میں اس وقت کیا ہوتا ہوگا جب کہ اُسے بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرنا پڑتا ہے۔

مٹی میں جادو بھرا ہے جو بیج کو پودوں میں بدل دیتا ہے۔ راجو نے کئی مرتبہ دھنیے اور میتھی کے بیج بوئے اور اُس نے اُن کو جڑوں، شاخوں اور پتیوں میں بدلتے دیکھا۔ راجو کے لیے زمین کے نیچے کی دنیا بے حد دل کش اور پُر اسرار تھی جو کہ اُس کی اپنی دنیا سے مختلف تھی اور اسی لیے وہ کھودتا ہی کھودتا رہتا تھا۔

ایک دن، جب راجو مٹی کھود رہا تھا، اُسے لگا، وہ اور زیادہ گہرا نہیں کھود سکتا اور نہ ہی اپنی پنسل کو باہر نکال سکتا ہے۔

اُس نے اپنی انگلیوں سے مٹی کھودنا شروع کی۔ اچانک اُس کے ہاتھ میں بال آگئے۔ راجو نے بالوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اچانک ایک آواز آئی، ایسا نہ کرو، تکلیف ہوتی ہے۔

راجو نے گھبرا کر مٹی چھوڑ دی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سوراخ میں ایک ننھا بچہ کھڑا تھا جو کہ اُس کے ہاتھ سے زیادہ بڑا نہ تھا۔ یہ دیکھ کر اُسے اور بھی تعجب ہوا کہ یہ ننھا بچہ ہو بہو اُسی جیسا تھا، اُس کے جیسے گھونگھریالے بال، آنکھیں اور چمچماتے دانت۔

"تم کون ہو، اور میری طرح کیوں دِکھتے ہو؟ تم یہاں زمین کے اندر کیا کر رہے ہو؟" راجو نے ننھے راجو سے پوچھا۔

"میں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا" ننھے راجو نے جواب دیا۔ "یاد کرو تمہاری سائیکل کی چابی اسی باغ میں کھو گئی تھی؟"

"ہاں، ہاں، مجھے یاد ہے۔ میں نے بہت تلاش بھی کی لیکن ڈھونڈ نہ سکا۔ مجھے بتاؤ، کیا میری چابی تمہارے پاس ہے؟"

"نہیں" ننھے راجو نے جواب دیا۔ "میرے پاس تمہاری چابی نہیں ہے، میں ہی تمہاری چابی ہوں!"

"تم؟ میری چابی! تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ تم ایک بچے ہو، تمہارے سَر پر بال، آنکھیں اور کان ہیں، جب کہ میری چابی تو چاندی کی تھی"۔

ارے معاف کرنا! بھول گیا تم کھوئی ہوئی چیزوں کی زمین کے بارے میں نہیں جانتے ہو"۔ ننھے راجو نے جواب دیا۔

"کھوئی ہوئی چیزوں کی زمین۔ تم کیا بول رہے ہو؟" راجو بڑ بڑایا، لیکن ننھے راجو کی کہانی میں اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔

کھوئی ہوئی چیزوں کی زمین وہ جگہ ہے جہاں کھوئی ہوئی چیزیں رہتی ہیں۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کی شکل میں وہاں نہیں رہتیں بلکہ انھیں لوگوں کی شکلوں میں، جن کی چیزیں کھو گئی ہوتی ہیں۔ اس طرح کھوئی ہوئی چیزوں کی زمین میں، تمہاری چابی تم خود ہی بن گئے ہو، یعنی میں میرا نام راجو چابی ہے۔ تمہاری ماں کی کانوں کی بالیاں بھی وہاں ہیں۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی کی شکل میں ہیں۔ پرپابالی۔ راجو نے یہ نہیں دیکھا کہ راجو چابی سوراخ سے باہر نکال رہا تھا اور خود کو جھاڑ رہا تھا۔

"تم کہاں چلے"؟۔ راجو نے پوچھا۔

"جا رہا ہوں؟ میں کہیں نہیں جا رہا! میں تمہارے ساتھ ہی آ رہا ہوں" راجو چابی بولا۔

"میرے ساتھ، کیا واقعی" راجو اُچھل پڑا۔ "کیا تمہارے دوست تمہیں یاد نہیں کریں گے؟"

"ہمارا اپنا قاعدہ ہے" راجو چاپی نے جواب دیا۔ "اگر ہمیں ہمارے ملک ہی ڈھونڈ لیتے ہیں تو ہم ایک دن اُن کے ساتھ گذار سکتے ہیں۔ میں سورج ڈوبنے پر ہی لوٹوں گا۔ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کتنا مزہ آئے گا۔ تمہیں شاید معلوم نہیں میں تمہیں کس قدر یاد کرتا ہوں"۔ میں تمہاری جیب میں رہ کر کتنی بہت سی جگہوں پر جایا کرتا تھا۔ مجھے جو سب سے اچھا لگا تھا وہ یہ تھا جب تم نے چابیوں کے گچھے کو اپنی اُنگلی میں ڈال کر گھمایا، کھلی ہواہیں میں کس قدر گھوما تھا"۔

راجو جھکا ہوا چاپی کی باتیں سُن رہا تھا۔ چاپی اُچک کر راجو کے کپڑوں پر چڑھتے ہوئے اُس کے کندھے پر جا بیٹھی اور پھر بولی۔ "مجھے اپنی سائیکل دکھاؤ، مجھے اس پر سواری کرنا اچھا لگتا ہے"۔

راجو نے سائیکل پر چاپی کو بٹھا کر باغ میں چکر لگایا۔ اچانک راجو کو ایک خیال آیا۔ اس نے چاپی سے پوچھا۔ "تم تو بڑے آرام سے چڑھ جاتی ہو، کیا تم میرے بھائی کی الماری پر بھی چڑھ سکتی ہو اور اوپر والے خانے سے میرے لیے ببل گم لا کر دے سکتی ہو"۔

چاپی فوراً مان گئی اور دوسرے ہی لمحے الماری پر چڑھ گئی۔ ببل گم تلاش کرتے ہی، اس نے راجو کی طرف اُچھال دی اور پھر انھوں نے آپس میں بانٹ لی۔

راجو کے دماغ میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے اپنے دوستوں کو اپنے گھر بلایا اور اُن سے کہا کہ اس نے ایک نیا جادو سیکھا ہے۔ بچے فرش پر بیٹھ گئے۔ ایک پردے کے سامنے اور پھر راجو نے اپنا کام شروع کیا۔

اُس نے اعلان کیا کہ جب وہ ناقص غذا کھائے گا، وہ سکڑ کر چھوٹا بن جائے گا اور جب اچھا صحت مند کھانا کھائے گا تو بڑا ہو جائے گا۔ پردے کے پیچھے سے اُس نے کہا۔ اب میں ایک کیلا کھا رہا ہوں اور پھر چھلکا بچوں کی طرف اُچھال دیا۔ وہ خود بچوں کے سامنے آ گیا اور کہا، دیکھو میں بڑا ہوں۔ ایک بار پھر پردے کے پیچھے چھپتے ہوئے، اس نے کہا۔ "میں اب ایک چاکلیٹ کھا رہا ہوں" اور چاکلیٹ کا کاغذ بچوں کی طرف پھینک دیا۔ اِس مرتبہ اُس نے چاپی کو پردے کے باہر بھیجا۔

بچے یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے، کچھ کی تو گھگھیاں بندھ گئیں اور کچھ حیرانی سے اپنے دوست کی طرف دیکھنے لگے کہ اُس کو کیا ہو گیا ہے۔ راجو نے مختلف کھانے کھا کر اس عمل کو بار بار دہرایا۔ ہر مرتبہ صحت مند کھانے کے بعد اُس نے اپنے آپ کو سب کے سامنے پیش کیا اور غیر صحت مند کھانا کھانے کے بعد، چاپی کو پردے سے باہر بھیجا۔

بچوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ انھوں نے راجو کو اصلی جادوگر ہی سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ اب ہمیشہ صحت مند کھانا ہی کھایا کریں گے۔

راجو اور چابی کو یکایک احساس ہوا کہ سورج غروب ہونے والا ہے۔ وہ باغ کی طرف چل پڑے اور چابی کے سوراخ کے پاس پہنچ گئے۔

چابی نے راجو کو پیار کرتے ہوئے کہا "اچھا راجو، اجازت۔ تم ایک اچھے دوست ہو اپنا اور اپنی چیزوں کا خیال رکھنا۔ کھوئی چیزوں کی زمین میں بھیڑ بڑھتی جا رہی ہے"۔

اب راجو کو اپنی چیزوں کا بہت خیال ہے۔ وہ کھوئی ہوئی چیزوں کی زمین میں اور بھیڑ نہیں ہونے دے گا۔

ایک وقت میں ایک قدم

چیریل راؤ

"پاپا" وہاں میں دوبارہ نہیں جاؤں گا" نلیش نے صاف کہہ دیا۔

مسٹر پاٹل نے کوئی جواب نہ دیا تو نلیش بے چین ہو اٹھا۔

"روہن ایک بد تمیز لڑکا ہے، وہ بڑبڑایا"۔ وہ جی۔ آئی۔ جو کے سارے بہترین کھلونے تو اپنے لیے رکھتا ہے اور مجھے چند لڑاکو اور تھوڑے سے ہتھیاروں کے ساتھ اُس کا دشمن بننا پڑتا ہے اور کھیل کے بیچ ہی میں وہ اپنے فائدے کے لیے نئے قانون بھی گھڑنے لگتا ہے۔

مسٹر پٹیل پھر بھی کچھ نہ بولے

"پاپا، کیا آپ سن نہیں رہے؟"۔ نلیش زور سے بولا۔

"جو کچھ تم نے کہا میں نے سب سنا" مسٹر پٹیل نے جواب دیا۔

"تو پھر دوبارہ میرا وہاں نہ جانا ٹھیک ہے نہ، بتائیے"۔

"بیٹا، جیسا تم ٹھیک سمجھو"، اُس کے والد نے کہا۔ میں تمہیں کبھی بھی کسی ایسے کام کے لیے مجبور نہیں کروں گا، جس میں تمہیں قطعی دلچسپی نہ ہو"۔

مسٹر پٹیل یہ کہہ کر بر آمد کی طرف چل پڑے، نلیش اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ باہر کھڑے ہو کر ستاروں کو دیکھنے لگے۔ مسٹر پٹیل بولے۔ "جب بھی رات میں میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں، مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم لوگ کس قدر چھوٹے اور غیر اہم ہیں۔ ہم چھوٹے اور معمولی انسان، پھر بھی ہم اپنے آپ کو کتنا اہم سمجھتے ہیں۔ ہم مریں یا جئیں کسی پر کیا فرق پڑتا ہے؟"

نلیش اُلجھن میں پڑ گیا، پاپا کیا کہنا چاہتے تھے۔ وہ پہیلی کیوں بجھا رہے تھے۔ خیر چھوڑو، میں اس بارے میں زیادہ کیوں سوچوں۔ مجھے تو بس ایک ہی ڈر تھا کہ پاپا مجھے روہن کے گھر جانے کے لیے مجبور کریں گے کیوں کہ پاپا اور انکل Satpute دوست تھے۔ اب میں وہاں نہیں جانا چاہتا تھا، مجھے اپنی بیٹنگ پریکٹس کے لیے بھی تو وقت چاہیے ہو گا۔

دوسری شام، نلیش چھ بجے کے بعد پارک میں ہی کھیلتا رہا جب کہ عام طور پر اس وقت وہ روہن کے گھر جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی بیٹنگ میں مگن تھا کہ اچانک اُس کی نظر روہن کے گھر کی طرف اُٹھ گئی۔ اُس نے کھڑکی میں روہن کی جھلک سی دیکھی۔ اُس کی توجہ ذرا سی ہٹی نہ تھی کہ وہ آؤٹ ہو گیا۔

آؤٹ، اُس کے ساتھی زور سے چلائے۔

نلیش نے مایوسی میں اپنا بیٹ چھوڑ دیا۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک نامناسب خیال آیا۔ یہ سب روہن کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر میں نے اُس کی طرف نہ دیکھا ہوتا تو میں ابھی بیٹنگ کر رہا ہوتا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر میچ دیکھنے لگا لیکن اُس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بار بار روہن کی کھڑکی کی طرف دیکھتا، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

نلیش اپنے دوستوں سے وداع لے کر تیزی سے چل پڑا۔ جب وہ روہن کے گھر کے قریب پہنچا اُس نے مسز Satpute کی آواز سنی، وہ کہہ رہی تھیں "روہن تمہارا انتظار کر رہا ہے" اُس کو اپنے اندر اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

روہن کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ آہستہ آہستہ اُس نے اپنی وہیل چیئر کو گھمایا اور نلیش کے سامنے آ گیا۔ "تم نے کھیلنا کیوں بند کر دیا، کیا تم آؤٹ ہو گئے، اس لیے"

نلیش نے سر ہلایا، اُس نے روہن کی آنکھوں میں لالی دیکھ لی تھی، پھر بھی وہ ٹھیک سے نہ سمجھ سکا کیوں کہ روہن اپنے ہاتھ والے کھلونے کو دیکھ رہا تھا۔ کیا روہن رو رہا تھا کیوں کہ وہ نلیش، ہر روز کی طرح، شام چھ بجے نہیں آیا تھا۔

بچوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔ ہر ایک دوسرے کے پہلے بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

مسز Satpute اُدھر آ گئیں۔ کیوں روہن تم نے ملیش کو بیٹھنے اور اپنے ساتھ کھیلنے کے لیے نہیں کہا۔

روہن نے خفگی سے کندھے اُچکائے، "تھوڑی دیر کھڑے رہنے میں وہ مَر نہیں جائے گا وہ اپنے آپ کھلونوں سے کھیل سکتا ہے۔ اسی لیے تو وہ یہاں آیا ہے۔ ٹھیک ہے نہ؟"

مسز Satpute نے التجا بھری آنکھوں سے ملیش کی طرف دیکھا جیسے وہ اُس سے کہہ رہی ہوں کہ روہن کی بات کا بُرا نہ ماننا۔ "روہن بہت رنجیدہ تھا کیوں تم آج بہت دیر سے آئے ہو"، انھوں نے بات بنائی۔

"نہیں مجھے کوئی افسوس نہیں" روہن، ایک کھلونے کو میز کی طرف اُچھالتے ہوئے بولا۔ "میں بہت خوش ہوں۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں"۔

ملیش نے محسوس کیا کہ روہن کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ اُسے روہن کی بات پر غصہ نہیں تھا۔ اُس کے تمام جسم میں ایک ہمدردی کی لہر دوڑ گئی۔ روہن کو اُس کے ایکسیڈنٹ کے بعد ایک وہیل چیئر تک محدود ہو جانے پر کس قدر تکلیف ہوتی ہوگی۔ اُس کا ناراض ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی جب کہ وہ اتنی دیر سے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

مسکراتے ہوئے، ملیش نے کہا، "اب میں دوبارہ کبھی دیر سے نہیں آؤں گا۔ مجھے یہ خیال ہی نہیں تھا کہ تم میرا اس بے چینی سے انتظار کرتے ہو"۔

"نہیں میں کیوں تمہارا انتظار کروں گا"، روہن لاپرواہی سے بولا۔

ملیش اچھی طرح جانتا تھا کہ روہن جھوٹ بول رہا ہے۔

وہ دونوں بوگل کا کھیل کھیلنے لگے۔ ملیش پوری طرح مات کھا گیا۔ جب کہ اُس کے ذہن میں لفظوں کا ڈھیر تھا کیوں کہ اُس کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ اُس میں اور روہن میں بڑا فرق تھا۔ "بھئی یہ ٹھیک نہیں"، ملیش نے مایوسی سے کہا۔ "تم تو چلتی پھرتی ڈکشنری ہو، میں آیندہ تمہارے ساتھ لفظوں کا گیم نہیں کھیلوں گا"۔

"کیوں"! روہن نے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ "کیا تم ہار برداشت نہیں کر سکتے؟"

ملیش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس کے الفاظ اُس کے ذہن میں کھٹک رہے تھے، روہن ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا، میں واقعی ہار برداشت نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے پاپا مجھ سے سب طرح کے گیم کھیلنے کو کہتے ہیں، صرف وہی نہیں جن کا میں ماہر ہوں۔ وہ مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں ہار کو برداشت کرنا سیکھوں۔

"تم اتنی دیر سے کہاں تھے"، ملیش کے گھر پہنچنے پر مسٹر پٹیل نے پوچھا۔ "میں جب پارک کے پاس سے گذرا، تو میں نے تو تمھیں وہاں نہیں دیکھا"۔

"میں روہن کے گھر چلا گیا تھا، آپ کو تو معلوم ہی ہے میں وہاں ہر روز جاتا ہوں"۔

"میں نے سوچا تم دوبارہ وہاں نہیں جاؤ گے کیوں کہ وہ ایک بد تمیز لڑکا ہے"، اُس کے والد نے کہا۔

"نہیں وہ اتنا بھی بُرا نہیں ہے"۔ نلیش نے شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا، "اب ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں"۔

"شاید اب تم زیادہ رعب نہیں مارتے"۔ مسٹر پٹیل نے ہلکے سے کہا۔

"پاپا میں خودسر نہیں ہوں۔"

"نہیں، بلکہ میں نے تو یہ سوچا کہ تم اپنا ایک الگ راستہ چنتے ہو اور اُس کو حاصل کرنے میں پوری طرح جٹ جاتے ہو۔ سچ تو یہ ہے، بہت سے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔"

ہم بہت کچھ اپنی زندگی کے تجربے سے سیکھتے ہیں"۔

نلیش کا چہرہ لال ہو گیا۔ پاپا ہمیشہ کی طرح ٹھیک تھے۔

اسی طرح کئی ہفتے گذر گئے۔ روہن کے یہاں جانا ایک عادت بن چکی تھی۔ اگر کبھی کسی وجہ سے وہ نہ جا پاتا تو اُسے تکلیف ہوتی۔ روہن بھی اب ناراض نہ ہوتا تھا جب کبھی نلیش وقت پر نہ پہنچ پاتا۔ اُسے نلیش کی محبت پر پورا اعتماد تھا۔ نلیش چاہے چند ہی لمحوں کے لیے سہی، آتا ضرور اور اپنے دوست کے ساتھ دن بھر کی باتیں کرتا، جو کہ صرف اپنے گھر تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔

تبھی اُن کی زندگی میں ایک بھونچال سا آگیا۔ روہن کا آپریشن ہونا تھا۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو وہ دوبارہ چل سکے گا۔ ایکسیڈینٹ کے بعد وہ مہینوں اسپتال میں پڑا رہا تھا۔ وہ دوبارہ اس تجربے سے نہیں گذرنا چاہتا تھا۔ وہ آپریشن کے خوف سے ہی لرز جاتا تھا۔

"شاید جلد ہی، ہم ساتھ ساتھ کرکٹ کھیلیں گے"، نلیش نے اپنے دوست کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بکواس نہ کرو، شاید میں چل ہی سکوں۔ میں دوبارہ کبھی نہ دوڑ سکوں گا"۔

اگر تم چل سکو گے تو بیٹنگ بھی کر سکو گے اور میں تمہارا (Runner) رنر بنوں گا"۔ نلیش نے اصرار کیا۔ "یہ میرا وعدہ ہے میں تم سے ملنے اسپتال میں بار بار آؤں گا"۔

اپنے دوست سے جدا ہوتے وقت نلیش کے گلے میں کوئی چیز اٹک سی گئی تھی۔

اُسی ہفتے ششماہی امتحان شروع ہو گئے اور وہ پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ روہن سے ملنے دوبار اسپتال گیا، کیوں کہ اسپتال کافی دور تھا۔ ہر مرتبہ اُس نے روہن کو نیم غنودگی کے عالم میں پایا، وہ بہت تھکا ہوا اور کمزور نظر آرہا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے زیادہ بات بھی نہ کر سکے۔ ملیش نہیں چاہتا تھا کہ روہن اُسے ایسا نظر آئے جیسا کہ وہ نظر آرہا تھا۔ کمزور اور بے جان، اُس کی آنکھوں سے تمام چمک جاتی رہی تھی۔ اُسے یہ سوچ کر بھی ڈر لگتا تھا کہ روہن ایک قدم بھی چلنے سے مجبور ہے جب کہ ملیش آرام سے اُچھل کود سکتا تھا۔

جاڑوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور ملیش، روہن سے اور روہن کی مدد سے محروم ہو گیا جو کہ روہن آسانی سے اپنے کمپیوٹر کے ذریعہ فراہم کیا کرتا تھا۔ میں نے روہن سے بہت کچھ سیکھا تھا، ملیش نے محسوس کیا۔ میں نے کچھ دینا اور کچھ پانا سیکھ لیا تھا اور سب سے زیادہ یہ کہ جو کچھ میرے پاس تھا، میں نے اسی میں مطمئن ہونا سیکھ لیا تھا۔

چھٹیوں کے دوران، مسز Satpute کے ساتھ کئی مرتبہ ملیش اسپتال گیا۔ روہن کو ہمیشہ فزیوتھراپسٹس (Physiotherapists) کے بیچ گھرا دیکھا۔ ملیش راہداری میں کھڑے کھڑے اور اسپتال کی زندگی کو دیکھتے ہوئے تھک جاتا۔

تین مہینے گذر گئے۔ روہن واپس نہ آیا۔ ملیش کو اُس کی بہت یاد آتی تھی۔ میں نے سوچا، شاید میں اُس کے پاس جاکر اچھا کرتا ہوں۔ مجھے یہ احساس بھی نہ تھا کہ روہن میرا اتنا اچھا دوست ہو گا۔ اب جب کہ وہ مجھ سے دور ہو گیا ہے مجھے اُس کی اہمیت معلوم ہو چکی ہے، کاش وہ دوبارہ واپس آجائے۔

آہستہ آہستہ یادیں مٹنے لگیں اور وہ بغیر روہن کے رہنا سیکھ گیا۔ اُس نے ساتواں درجہ پاس کر لیا۔ کیوں کہ وہ ایک سینئر(Senior) طالب علم تھا، اس کو چھوٹے بچوں کو پی۔ٹی (.P.T) کرانے کی ذمہ داری دی گئی۔ اُسے کافی دوڑنا بھاگنا پڑتا تھا۔ اب وہ بمشکل اسپتال جاپاتا تھا۔ جب کبھی ملیش اور روہن ملتے، وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی سے لگتے۔ روہن سمجھ نہیں پاتا تھا کہ وہ کس طرح ملیش کو بتا سکے کہ وہ کس اذیت سے گذر رہا تھا۔ اور ملیش کو روزمرہ کی باتیں روہن کے لیے سنانا، بیوقوفی کی بات لگتا تھا جب کہ چلنے پھرنے کے امکانات جو کہ عام لوگوں کے لیے معمولی سی بات ہے، روہن کی زندگی کا ایک اہم سوال تھا۔ ایسا لگنے لگا تھا کہ اُن کی دوستی کمزور پڑتی جارہی تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔

ایک سنیچر کی دوپہر جب کہ ملیش، روہن کے گھر کے باہر کھڑا تھا، مسز Satpute نے اُس سے اپنے ساتھ اسپتال جانے کے لیے کہا۔ وہ اُن کے دروازے پر جا پہنچا اور گھنٹی بجائی۔ مسز Satpute نے دروازہ کھولا۔ وہ اُس کو اندر لے گئیں اور وہ سیدھے اسٹڈی کی طرف چلے گئے۔ اچانک دروازے میں کوئی سامنے کھڑا تھا۔ ایک لڑکا جو ملیش سے زیادہ لمبا تھا۔ اُس کے لمبے بال اُس کے کالر پر بکھرے پڑے تھے۔ وہ مسکرایا بھی نہیں اور ملیش کی طرف بڑھا اپنا ایک

پاؤں گھسیٹتے ہوئے وہ چل رہا تھا۔ نلیش دم بخود کھڑا تھا۔ یکایک وہ خوشی سے چلّا اُٹھا۔ "روہن، میں تمھیں پہچان نہ سکا، ارے تم اس قدر لمبے اور کتنے مختلف ہو گئے ہو"۔

روہن نے مذاقاً کہا "بہر حال کھڑا ہو گیا ہوں، شاید تم نے مجھے ایسا کبھی نہیں دیکھا؟" نلیش اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ وہ کود کر روہن کی طرف لپکا اور اُسے گلے لگا لیا وہ اُس کی پیٹھ پر تھپکی دے رہا تھا۔

اُن کے احساسات لوٹ آئے تھے۔ اُن کی دوستی ختم نہیں ہوئی تھی۔ یہ اُن کے پیچھے اور سامنے پروان چڑھتی رہی۔ انھیں ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ایک وقت میں ایک قدم ہی ٹھیک ہے۔

"بھگوڑا انجن"

رُر جارانی اُستھانا

رات تاریک اور بھیگی ہوئی تھی۔

پچھلے تین دنوں سے متواتر بارش ہو رہی تھی، کبھی ہلکی پُھوار تو کبھی زوردار۔ ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ سوائے ایک قُلی اور لائن مین کے جو کہ دسمبر کی شدید ترین سردی سے بچنے کے لیے آگ جلا کر خود کو گرم رکھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ یہاں زیادہ گاڑیاں یہاں رُکتی بھی نہ تھیں، لیکن کیوں کہ یہ مین لائن تھی اس لیے یہ اسٹیشن اہم بن گیا تھا اور اہم ترین گاڑیاں یہاں سے گذرتی تھیں۔

اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر، مسٹر شیخاوت اپنے کیبن میں موجود تھے اور ایک بڑے رجسٹر میں بہت احتیاط سے کچھ اندراج رہے تھے۔ سدھارتھ ایک آرام کرسی پر تکیہ لگائے ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔

"کیا بور ہو رہے ہو؟" مسٹر شیخاوت نے پوچھا۔

"بالکل نہیں، یہ کتاب واقعی دلچسپ ہے، چاچو۔ آپ کے پاس کتنی اچھی کتابیں ہیں خاص طور پر بھوتوں کی کہانیاں"۔ سدھارتھ نے اپنے چاروں طرف کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں بھوتوں کی کہانیاں پسند ہیں"؟ مسٹر شیخاوت نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بے حد شوق ہے ! پُر اسرار اور جوکھم بھری کہانیاں، جن میں غیر فطری چیزوں کا مسالہ بھی ہو۔ جن کو عقل تسلیم بھی نہ کرتی ہو"۔

"کیا تمہیں بھوتوں سے ڈر نہیں لگتا؟" "میں نے سنا ہے آج جیسی رات بھوتوں کے باہر نکلنے کی رات ہے"۔ مسٹر شیخاوت نے سدھارتھ کو ڈرانے کی کوشش کی۔

چاچو، کیا آپ سوچتے ہیں میں ایک چھوٹا بچہ ہوں جو بھوتوں سے ڈر جاؤں گا۔ اُس نے احتجاج کیا۔ تھوڑی دیر بعد، اُس نے ہلکے سے پوچھا۔ "کیا واقعی بھوت ہوتے ہیں؟"۔

"میں نے لوگوں سے سنا ہے۔ چند سال پہلے ایک گاڑی، نزدیکی دریا میں گر گئی تھی۔ بہت ہی بُرا حادثہ ہوا تھا۔ بہر حال بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اُس ٹرین میں مرنے والوں کے بھوت اکثر جائے حادثہ پر آتے ہیں"۔ مسٹر شیخاوت سنجیدگی سے بولے۔ انھوں نے سدھارتھ کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہ زور سے ہنس دیے۔ ہا، ہا، ہے۔ نہیں، سدھارتھ اکیسویں صدی میں بھوت پریت کچھ نہیں ہوتے۔ میرا کام بس ختم ہونے کو ہی ہے۔ رجسٹر کا کام ختم کرتے ہی، ہم اپنے کوارٹر چلیں گے اور، آلو پراٹھا، کھیر، اور مٹر پنیر کھائیں گے جو تمہاری چاچی نے بنا رکھا ہے"۔

"آپ آرام سے اپنا کام کریں، مجھے کوئی جلدی نہیں ہے"۔ سدھارتھ نے جواب دیا۔

رام نگر شِوالک پہاڑیوں کے دامن میں چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ یہ دہلی اور پنجاب کی مین لائن پر واقع تھا۔ رام نگر میں دو دریا بہتے تھے، مرکنڈا اور ٹانگری۔ یوں تو یہ دونوں چھوٹے دریا تھے لیکن برسات میں اکثر باڑھ آجایا کرتی تھی۔ سدھارتھ اپنے چاچو کے ساتھ جاڑوں کی چھٹیاں بتانے یہاں چلا آیا تھا۔ اُس کے والدین ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے بیرون ملک گئے ہوئے تھے۔ اس کی چچی کو اچانک اپنے بھائی کے گھر جانا پڑ گیا تھا اور مسٹر شیخاوت نے اپنے بھتیجے کو رات میں گھر پر اکیلا چھوڑنا مناسب نہ سمجھا، اسی لیے سدھارتھ اپنے چاچو کے کیبن میں بیٹھا بھوتوں کی کہانیاں پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا اور لیٹنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اُس وقت اُس نے گاڑی کی ہلکی سے سیٹی سنی۔

"چاچو، میں نے ابھی ابھی انجن کی سیٹی سنی ہے"۔ انجن کی سیٹی"؟، "یہ کیسے ہو سکتا ہے، اگلے ڈھائی گھنٹوں میں یہاں کوئی بھی گاڑی آنے والی نہیں۔ آخری گاڑی سہارنپور پسنجر تھی جو کہ شام ہی کو جا چکی۔ اگلی متوقع ٹرین، ایک میل

ٹرین ہے جو پٹھان کوٹ جائے گی اور وہ آدھی رات کو ہی یہاں سے گذرے گی۔ اُس کے جانے میں تو بہت دیر ہے"۔ مسٹر شیخاوت نے میز پر پھیلے چارٹ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ انھوں نے اپنا جملہ مکمل بھی نہ کیا تھا کہ اسٹیشن انجن کی آواز سے گونج اُٹھا۔ مسٹر شیخاوت اپنی کرسی سے اُچھل پڑے اور باہر کی طرف بھاگے۔ سدھارتھ اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔

گنگارام قلی اور مہر دین لائن مین حیران پریشان کھڑے تھے اور ایک دوسرے کی طرف بے یقینی سے دیکھ رہے تھے۔

"انجن کی سیٹی...... لیکن نہیں......اس وقت تو کوئی بھی ٹرین نہیں ہو سکتی......"۔

وہ سب کے سب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔ موسلادھار بارش اور جاڑے کی اندھیری رات میں اُن کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔ تبھی سیٹی کی آواز دوبارہ آئی اور ساتھ ہی، دھڑ دھڑاتا انجن اسٹیشن میں داخل ہو گیا اور ابھی وہ اپنے حواس پر قابو بھی نہ کر پائے تھے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ چاروں انجن کو اندھیرے میں غائب ہوتے دیکھتے رہے جس طرح وہ اچانک ظاہر ہو گیا تھا۔ اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین کرنے میں کچھ وقت لگا۔

"یہ کدھر سے آیا تھا" مسٹر شیخاوت اچنبھے سے بولے۔

"سر آپ نے دیکھا تھا کہ وہ ایک اسٹیم انجن تھا جو کہ ان دنوں استعمال میں بھی نہیں ہیں"۔ مہر دین نے کہا۔

"چاچو میں نے کسی ڈرائیور کو بھی نہیں دیکھا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انجن میں ڈرائیور نہیں تھا"، سدھارتھ نے زور دے کر کہا۔

وہ سب کے سب حواس باختہ منہ کھولے کھڑے تھے۔ مسٹر شیخاوت فوراً اپنے دفتر کی طرف لپکے اور پاس والے اسٹیشن کو گھنٹی دی۔ نہیں اُنھیں کسی ایسے انجن کے بارے میں کوئی علم نہ تھا جو بے وقت اس علاقہ میں گھوم رہا ہو۔

"مجھے اگلے جنکشن کو اس بھگوڑے انجن کے بارے میں اطلاع دینی چاہیے۔ اگلے دو گھنٹوں میں میل ٹرین یہاں آئے گی اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ دونوں ٹکرا جائیں"۔ اور وہ ٹیلی فون کرنے میں مصروف ہو گئے۔

مہر دین مجھے پورا یقین ہے کہ یہ بھوت والا انجن تھا جس کے بارے میں لوگ کہانیاں سناتے ہیں"۔ گنگارام آہستہ سے بڑبڑایا۔ وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔

"کیا بھوتوں کا انجن، گنگارام کاکا، مجھے بھی کچھ بتائیے"، سدھارتھ نے منت کی۔

"گنگارام بچے کو مت ڈراؤ" مہر دین نے تاکید کی۔

"نہیں کاکا، کچھ تو بتائیے" سدھارتھ نے اصرار کیا۔

"بات کچھ اس طرح ہے کہ چند سال قبل یہاں سے کچھ دوری پر ایک ٹرین ایکسیڈینٹ ہوا تھا۔ ماکنڈا دریا پر ایک چھوٹا پُل تھا جو شدید بارشوں کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا کسی کو پتہ نہ تھا۔ جونہی ایک گاڑی کا انجن پُل پر آیا، وہ نیچے چڑھتے دریا میں گر گیا۔ خوش قسمتی سے بقیہ ڈبے، انجن سے جھٹکے کی وجہ سے الگ ہو گئے۔ صرف انجن ہی گرا۔ ڈرائیور اور اُس کے اسسٹنٹ کا کچھ پتہ نہ چلا۔ مسافر معجزانہ طور پر بچ گئے تھے۔ لوگ کہتے ہیں تب سے جب کبھی پُل پر کوئی خطرہ ہوتا ہے۔ انجن اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے ظاہر ہو جاتا ہے"۔

"کیا اس طرح کوئی حادثہ ہونے سے بچا ہے" سدھارتھ نے پوچھا۔

"خدا جانے۔ ایسا لوگ کہتے ہیں۔ یقینی طور پر تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ میرے خیال میں پہلے کسی نے کبھی اس کو دیکھا بھی نہیں" گنگارام بولا۔

مسٹر شجاعت واپس آگئے۔ "ہمیں لائن پر انجن تلاش کرنا ہوگا۔ اس مشغول ٹریک پر ہم کس طرح انجن کو کھلا چھوڑ سکتے ہیں۔ میں نے پاس کے تمام اسٹیشنوں کو ساری گاڑیوں کو وہیں روکے رہنے کو کہہ دیا ہے۔ مہر دین ٹرالی لے آؤ"۔

فوراً ہی مہر دین معائنہ کی ٹرالی لے آیا۔ گنگارام دو برساتیاں اور روشنی کے لیے ایک بیٹری لے آیا تھا۔ مسٹر شجاعت اُچک کر ٹرالی پر چڑھ گئے۔

"چاچو، کیا میں بھی ساتھ چل سکتا ہوں، چاچو، پلیز مجھے بھی ساتھ لے چلیے، سدھارتھ نے خوشامد کی۔

مسٹر شجاعت نے چند لمحوں کے لیے سوچا، "اچھا چلو، تم یہاں اکیلے کرو گے بھی کیا" انھوں نے گنگارام کو ٹیلی فون سننے کی ہدایت کی۔

مہر دین نے ٹرالی کو دھکا لگایا اور جیسے ہی وہ تیزی سے چلنے لگی، وہ بھی اس پر چڑھ گیا۔ انھوں نے روشنی کے لیے بیٹری آن کر دی۔ ریلوے ٹریک اور آس پاس کا سارا ایریا تیز روشنی میں نہا گیا۔ خوش قسمتی سے بارش اس وقت رُکی ہوئی

تھی۔ البتہ ہوا خاصی تیز تھی۔ وہ کچھ دیر اس طرح چلتے رہے۔ بھگوڑے انجن کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔

مہر دین ہم اسٹیشن سے کتنا دور ہوں گے؟ ہم تقریباً پندرہ منٹ سے چل رہے ہیں"۔ مسٹر شجاوت نے اپنی برساتی کو مضبوطی سے لپیٹتے ہوئے کہا۔

"جناب ہم مارکنڈا دریا کے پرانے پُل کے قریب ہیں"۔ مہر دین نے اپنے ہاتھوں کو گرم کرنے کے لیے رگڑتے ہوئے کہا۔

سدھارتھ خاموش ہی رہا لیکن اُسے اس ایڈونچر میں بہت مزہ آرہا تھا۔ اُس نے سوچا جب اسکول کھلیں گے تو اپنی کلاس کو یہ واقعہ بتانے میں اُسے کتنا مزہ آئے گا۔

اچانک اُنھیں گرتے ہوئے پانی کی آواز سنائی دی۔ انھوں نے دیکھا کہ بھگوڑا انجن ابھی بھی ریلوے ٹریک پر کھڑا ہے۔

مہر دین نے فوراً بریک لگائے۔ ٹرالی رُک گئی۔ وہ تیزی سے نیچے اترے اور انجن کی طرف دوڑے۔ شاید وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں اچانک وہ چل نہ دے۔ پانی گرنے کی آواز اب شور میں بدل گئی تھی۔ انجن وہاں موجود تھا۔ اور اس طرح کھڑا تھا جیسے کہ صدیوں سے کھڑا ہو۔ جب وہ انجن کے پاس پہنچے، وہ بڑبڑائے۔ آگے ریل ٹریک نہیں۔ پُل ٹوٹ چکا تھا اور نیچے چڑھتا دریا شور مچا رہا تھا۔ پُل کے تھوڑے بہت حصے ابھی بھی موجود تھے۔

اوہ میرے خدا! مسٹر شجاوت اس تصور سے ہی کانپ گئے۔ کیا ہوتا اگر اس انجن کے بجائے یہ میل ٹرین ہوتی۔ مسٹر شجاوت نے انجن کی طرف دیکھا۔ یہ ایک پرانا اسٹیم انجن تھا۔ مہر دین اور مسٹر شجاوت نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اُن کے چہرے سفید پڑ گئے تھے جیسا کہ انھوں نے ایک بھوت دیکھ لیا ہو۔

"کیا یہ وہی انجن ہے جو کئی سال پہلے حادثہ کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ تو برسوں سے ریلوے کے پُرانے کباڑ خانے میں کھڑا ہے"۔ مسٹر شجاوت آہستہ سے بڑبڑائے۔

"تو لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں" سدھارتھ بڑبڑایا۔ بھگوڑے انجن نے آخر کار ایک بڑے حادثہ کو ٹال دیا تھا۔

رولی اور سکّہ
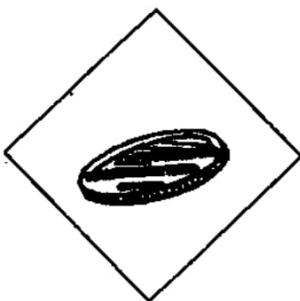
ارادھنا جھا

"آپ کی بس کے لیے پھول/اپنی بس کے لیے کچھ پھول لے جاؤ" ' پھول بیچنے والے نے کہا جو کہ سڑک کی پٹری پر ایک بڑی ٹہنیوں کی بنی ٹوکری لیے بیٹھا تھا۔

ہر صبح اسکول کی بلڈنگ کے باہر اُسے پھول بیچتے ہوئے دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ پانچ روپیہ فی گچھا بچوں کو بیچتا تھا۔

پھول بیچنے والے کی فیملی گاؤں میں تھی اور وہ روپیہ کمانے کے لیے شہر آگیا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک مرتبہ اُن سے ملا کرتا تھا۔ اُسے اپنی چار سال کی لڑکی، گڑیا، بہت یاد آتی تھی، اُس کا جی چاہتا تھا کہ کاش وہ اُسے اکثر دیکھ پاتا۔

رولی بھی چار سالہ بچی تھی۔ وہ ایک پیاری بچی تھی جس کی ٹھوڑی میں چھوٹا سا گڑھا اور سَر پر گھونگھریالے بال تھے۔ وہ اکثر اسکول جانے سے قبل پھول خریدا کرتی تھی۔ پھول بیچنے والا اس بچی کو بے حد پیار کرتا کیوں کہ وہ ہمیشہ بڑے پیار سے اور عزت سے بات کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اس لیے بھی کہ وہ اُسے اُس کی گڑیا کی یاد دلاتی تھی۔

رولی اپنی ٹیچر کو بہت پسند کرتی اور اُنھیں پھول دینا اُسے بے حد پسند تھا۔

"شکریہ، رولی" اُس کی ٹیچر مسکراتے ہوئے پھول قبول کرتیں۔ "پھول بہت خوب صورت ہیں۔ اب ہم ان کو گل دان میں سجائیں گے"۔

روبی کو ایسا کرنا بہت اچھا لگتا، کیوں کہ گُل دان کلاس کی الماری کے اوپر رکھ دیا جاتا تھا۔ وہاں پھول کتنے خوبصورت لگتے تھے۔
جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، روبی ہر روز اپنی ماں سے پھولوں کی فرمائش کرنے لگی۔

"اوہ ماما، پلیز ایک گلدستہ میرے لیے خرید لیں۔ میری ٹیچر بہت خوش ہوں گی"۔

روبی کی ماں کو ڈر تھا کہ یہ کہیں اُس کی عادت ہی نہ بن جائے۔ "نہیں، روبی آج نہیں۔ تمہیں ہر روز اپنی ٹیچر کو پھول نہیں دینا چاہیے"۔ وہ سختی سے بولتیں۔

روبی اصرار کرتی، کیوں کہ "نہیں" کا جواب اُسے پسند نہیں تھا۔

"پلیز ماما، وہ اپنی میٹھی آواز میں بولتی، مجھے تھوڑے پھول خرید دیجیے۔ میری کلاس روم ان پھولوں سے کس قدر اچھی لگتی ہے"۔

اس کی ماں میں زیادہ بحث کرنے کی طاقت نہ تھی اور جلد ہی وہ ہار مان لیتی۔ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی، جس کی بیٹی اس قدر مُصر ہو؟

ایک صبح روبی کی ماں کو خیال آیا۔ میں آج اپنا پرس ہی اسکول لے کر نہیں جاؤں گی۔ نہ میرے پاس پیسے ہوں گے نہ ہی پھول خریدنے پڑیں گے۔

ہمیشہ کی طرح روبی، پھولوں کی ٹوکری کے پاس رُک گئی۔ گلاب کے ایک گچھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُس نے کہا، "ماما، میں آج یہ لوں گی؟"

"سوری ڈیئر، ماں نے جواب دیا۔ آج میں اپنا پرس ہی نہیں لائی۔ پھول خریدنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں"۔

روبی یہ سن کر مایوس ہو گئی۔ اب وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ ڈھیلے قدموں سے، ماں کا ہاتھ پکڑے ہوئے اسکول کے دروازے کی طرف چل دی۔
اُس دن سے، اُس کی ماں نے اسکول اپنا پرس لے جانا ہی چھوڑ دیا۔

"سوری، روبی، وہ کہتی پرس نہیں تو آج پھول بھی نہیں"۔

بیچاری روبی! وہ اس طرح پھولوں کے رنگ برنگے گلدستے خریدنے سے محروم ہو گئی وہ ہر روز پھولوں کی ٹوکری کے پاس آکر رُک جاتی اور اُن کو لگاتار تکا کرتی۔ پھر وہ امید بھری نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتی جو ہمیشہ وہی بہانہ بنا دیتی۔

"تمہاری مِس کے لیے پھول! کیا اپنی مِس کے لیے پھول نہیں خریدو گی؟"

پھول بیچنے والا اُس کو رغبت دلاتا۔

روبی صرف اپنا سر ہلا دیتی اور خاموشی سے آگے بڑھ جاتی

ایک شام وہ اپنے گھر میں چھوٹی سی لال کار سے کھیلنے میں مگن تھی کیوں کہ یہ اُس کا پسندیدہ کھلونا تھا جو کچھ ماہ پہلے اُسے اُس کے والد نے دیا تھا۔

اس کو زور سے دھکیلتے ہوئے وہ چلائی، "زوم، زوم، زوم۔"
بیٹری سے چلنے والی کار سفید فرش پر تیزی سے چل پڑی۔

روبی اُس کے پیچھے دوڑی جب تک وہ رُک ہی نہیں گئی۔ وہ جیسے ہی اُس کو اٹھانے کے لیے جھکی، اُس نے ایک گول چمکدار چیز کار کے پاس پڑی دیکھی۔

یہ ایک روپیہ کا سکہ تھا۔

"اوہ، نیا سکہ، روبی خوشی سے چلائی۔ اُس نے فوراً اُسے اٹھالیا اور قریب سے دیکھنے لگی۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک مزے دار خیال آیا۔
"ماما، وہ تیز آواز میں بولی

"کیا بات ہے بیٹا؟ اُسکی ماں نے کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا جو کہ وہ پڑھ رہی تھی۔

روبی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی، اُس کے بھورے، گھنگریالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

"ماما، دیکھئے مجھے کیا ملا ہے" اُس نے کہا۔ اُس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ آہستہ سے اُس نے اپنا دلیاں ہاتھ پھیلا دیا۔ اُس کی ہتھیلی پر ایک چمکدار سکہ موجود تھا۔

"اوہ" اُس کی ماں بولی، یہ تمھیں کہاں ملا؟

"یہ میرے کمرے میں فرش پر پڑا تھا" روبی نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ماما، کیا میں اسے رکھ سکتی ہوں"۔

"ہاں ضرور، لیکن تم اس کا کیا کرو گی" اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں کل اپنی ٹیچر کے لیے پھول خریدوں گی" روبی نے جواب دیا۔

"پھولوں کا گلدستہ، ایک روپیہ کے سکے میں"، اس کی ماں نے پوچھا۔

"ہاں سُرخ گلابوں کا گلدستہ" رولی نے اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے گھنگریالے بال اس کے سر پر لہرا رہے تھے۔

رولی کی ماں نے تھوڑی دیر کے لیے کچھ سوچا، کیا میں رولی کو بتادوں کہ ایک روپیہ میں وہ پھول نہیں لے سکے گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے، وہ مسکرا دی، چلو اُسے کل اس سکّے میں پھولوں کا گلدستہ خریدنے ہی دو۔ رولی بڑی ہو رہی ہے۔ اُسے پیسے کی اہمیت سمجھنی ہی چاہیے۔

اُس رات رولی نے بڑی احتیاط سے اُس سکے کو دراز میں رکھ دیا۔ اگلی صبح اُس نے اپنے اسکول کی سفید یونیفارم میں رکھ لیا۔

"ماما، ہمیں اب چلنا چاہیے"۔ اُس نے پُر جوش لہجہ میں کہا۔

رولی اسکول گیٹ کے باہر ہی رُک گئی اور پھولوں سے بھری ٹوکری پر نظریں گاڑ دیں۔ اُس کی ماں نے کچھ نہیں کیا۔ وہ اس کو دیکھتی رہی۔

رولی نے گہرے سرخ گلابوں کا ایک گلدستہ چن لیا۔

"مجھے یہ والے گلاب چاہئیں"۔ اُس نے اپنی چھوٹی سی انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں، بچّی" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تم آج بہت دنوں بعد اپنی مس کے لیے پھول لے رہی ہو۔

رولی نے سر ہلاتے ہوئے تیزی سے گلاب اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اُس نے اپنا منہ نرم گلابی پتیوں میں چھپا لیا اور ایک لمبا سانس لیا۔

"آہ، کس قدر اچھی خوشبو ہے اور یہ کس قدر خوبصورت ہیں"۔

"رولی، مجھے افسوس ہے تم یہ لے نہ سکو گی"، اس کی ماں نے کہنا شروع کیا۔

چھوٹی معصوم بچّی نے چمکتی آنکھوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اُس کے بعد اُس نے پورے اعتماد سے کہا "آپ کو پیسے دینے کی ضرورت نہیں، ماما" "میں آج اپنے پیسوں سے، اپنے سکّے سے پھول خریدوں گی"۔

"ٹھیک ہے، رولی" ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اُسے رولی کے لیے افسوس ہو رہا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ آگے کیا ہونے والا تھا۔ وہ آدمی ایک روپیہ والا سکہ اُس کو واپس کر دے گا اور اپنے پھول لے لے گا۔

بے چاری رولی کا دل ٹوٹ جائے گا، اُس کی ماں سوچنے لگی۔ بہر حال وہ صرف چار سال کی ہی تو ہے۔ اور وہ نہیں جانتی کہ روپیہ کی کیا قیمت ہوتی ہے۔ لیکن آج اُس کو ایک صحیح سبق ملے گا۔ وہ روپیہ کی اہمیت جان لے گی۔

روبی کی ماں انھیں خیالوں میں غرق تھی۔ روبی نے لاپرواہی سے اپنی جیب سے سکہ باہر نکالا اور مسکراتے ہوئے اُس نے سکہ پھول بیچنے والے کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اُس آدمی نے روپیہ کے سکے کی طرف دیکھا۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُس نے بچی کے مسکراتے چہرے کی طرف دیکھا۔

روبی امید بھری آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُس نے اپنی ٹیچر کے لیے اُس صبح پھول لے جانے کا عہد کر رکھا تھا اور وہ بھی اپنے پیسوں سے یہ سوچ کر ہی اُس کا چہرہ خوشی اور فخر سے کھل اُٹھا۔

پھول بیچنے والے نے دوبارہ سکے کو دیکھا۔ پھر اُس نے اُس چھوٹے سے پیکر کی طرف دیکھا۔

جو اُس کے روبرو کس قدر خوش اور پُر امید تھا۔

اچانک اُس کے خیالوں میں اُس کی گڑیا آگئی۔ اُسے پچھلے کچھ دنوں سے اُس کی بہت یاد آرہی تھی۔ اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس کو دیکھے، اور اُس کے ساتھ کھیلے۔ اُس کی معصوم باتیں اور کھنکھناتی ہنسی اُسے یاد آرہی تھیں۔

اُس وقت اُس کے سامنے روبی نہیں بلکہ اُس کی اپنی بیٹی پھول لینے کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔

پھول بیچنے والا جذباتی ہو گیا تھا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس نے اپنا سر ہلایا اور روپیہ کا سکہ اپنی جیب میں ڈال لیا۔

اپنے جذبات پر قابو پا کر وہ بولا۔ "بیٹی یہ گلاب کے پھول لے لو۔ میرے پاس سب سے اچھے یہی ہیں"۔ اور اُس نے دوسرے گاہک سے بات شروع کر دی۔

"ماما، دیکھیے"، روبی خوشی سے چلائی۔ میں نے اپنے سکے میں پھول لے لیے۔ اُس نے گلابوں کے گلدستے کو اپنے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔

اُس کی ماں حیران تھی۔ صرف ایک روپیہ میں روبی نے خوبصورت گلابوں کا گلدستہ کیسے لے لیا؟ اُس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ ایک بات تو پکی تھی کہ اُس نے اُس کو مات دے دی تھی۔

اُس نے بچی کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ "پھول بہت خوبصورت ہیں، چلو چلیں"۔ وہ اُس کو اسکول کی طرف لے چلی۔

پھول بیچنے والا روبی کو جاتے دیکھتا رہا، اُس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اصل میں وہ ہی اس سکے کی صحیح قیمت جانتا تھا۔ اس کے لیے اُس کی قیمت ایک روپیہ سے کہیں زیادہ تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ اُس کی کوئی قیمت ہی نہیں تھی۔

کیوں کہ کیا یہ اُسے اُس کی اپنی گڑیا نے نہیں دیا تھا؟

یاد کا وقتی طور پر چلا جانا

مادھوی مہادیون

نیل اسکول جا رہا تھا۔ صبح بہت خوشگوار تھی، صاف شفاف ٹھنڈی ہوا اور حد نظر تک پھیلا ہوا نیلا آسمان۔ نیل کو اسکول پیدل جانا بہت پسند تھا۔ اس وقت گنیش ٹمپل والی سڑک پر بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی تھی لیکن بعد میں تو یہ جگہ پہچان میں بھی نہیں آتی تھی۔

نیل کی دادی ماں، امّی نے اُسے بتایا تھا ایک زمانہ تھا جب اُن کی سڑک پر ہر گھر میں باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ چڑیوں کا چہچہانا اور مندر کی گھنٹیاں، ان کے علاوہ اور کسی قسم کا شور نہ تھا۔ بعد میں بڑے بڑے بلڈر آئے اور اس مرکزی ایریا پر قابض ہونے لگے۔ انہوں نے اس جگہ کو "پرائیم پراپرٹی" کا نام دیا۔

ایک کے بعد ایک مکان گرائے جانے لگے اور دیکھتے دیکھتے لگژری اقامتگاہیں، بڑے بڑے اسٹور اور دفاتر بن گئے۔ پیڑ کاٹ دیے گئے اور چڑیاں کہیں اور جا بسیں اور دنیا کے لیے گنیش ٹمپل اسٹریٹ ایک بڑی جگہ بن گئی۔

لیکن اس ایریا میں ایک چھوٹا سا کونہ ویسا کا ویسا ہی رہا۔ امّی نے اپنی زمین بلڈر کو بیچنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ایک سے ایک بڑھ کر قیمت لگائی۔ لیکن امّی نے بھی اپنی آواز کو سخت بنالیا اور صاف صاف بلڈروں کو کہہ دیا کہ اُن کا پیسہ انھیں توڑ نہیں سکتا۔ بلڈروں نے وقتی طور پر شکست مان لی لیکن امید نہیں چھوڑی۔

امّی کی جیت دیرپا نہ تھی۔ اُن کی فیملی۔ دو لڑکے، اُن کی بیویاں اور بچے اُن سب کو بلڈروں کی طرف سے آئی آفر

اچھی لگتی تھی۔ اچانک انھوں نے موٹر گاڑیوں، بیرون ملک چھٹیاں منانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ لیکن اتّی کی وجہ سے اُن کے تمام خواب ادھورے تھے۔

"اتّی دقیانوسی ہیں" وہ لوگ بڑبڑاتے۔ وہ ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتیں، دشمن ہیں، ڈکٹیٹر ہیں۔ گھر میں انھوں نے کس قدر قاعدے قانون چلا رکھے ہیں۔ زور سے میوزک نہیں سنتے۔ ٹی وی نہیں، فلم میگزین نہیں لا سکتے، باہر کھانا ٹھیک نہیں، دیر تک باہر رہنا ناپسند ہے۔ وہ تو بالکل پرانے خیالات کی ہیں۔ انسان کو زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے"۔

اتّی یہ سب باتیں سنتیں، انھیں غصہ آنے لگتا۔

اسی صبح زور دار جھگڑا ہوا۔ عام طور پر کوئی بھی اتّی سے الجھتا نہیں تھا۔ وہ بہت سخت زبان بولتی تھیں۔ جھگڑے کا مطلب تھا، ایک دوسرے کو اُس کی اوقات یاد دلا دینا۔ اس کے باوجود نیل کی اٹھارہ سالہ چچازاد بہن نے اتّی سے فیصلہ کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔

اتّی کو جس چیز پر بہت ناز تھا۔ وہ بال تھے۔ سپنا کے بال، لمبے چمکدار اور سیدھے۔ اتّی کو اس طرح کے بال بے حد پسند تھے۔ اتّی کے علاوہ، اور کوئی سپنا کے بالوں کو درست نہیں کر سکتا تھا، حتیٰ کہ خود سپنا کی ماں، ایلا بھی۔ اتّی سپنا کے بالوں میں تیل لگاتیں، کنگھا کرتیں اور اچھی طرح سنوارتیں۔ جب سے سپنا کالج میں داخل ہوئی تھی وہ اپنے بال کٹوانا چاہتی تھی۔

"نہیں" اتّی نے کہا۔ "ہرگز نہیں"۔

"یہ میرے بال ہیں"۔ سپنا نے غصے سے کہا۔

"میں ان کے ساتھ کیا کروں، یہ میرا اپنا کام ہے۔ آپ مجھ سے میرا حق چھین رہی ہیں"۔

"حقوق اُن کے ہوتے ہیں جو صحیح اور غلط کے فرق کو سمجھتے ہیں"۔ اتّی نے زور دے کر کہا۔

"بڑوں سے بحث کرنا اچھی بات نہیں ہے"۔

سپنا ناراض ہو گئی۔

صبح کے جھگڑے نے اتّی کو بُری طرح پریشان کر دیا تھا۔ وہ سوچنے لگیں۔ مجھے بچّی سے اس قدر سختی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ لیکن اگر میں سختی سے کام نہیں لوں گی تو جس کی جو مرضی ہو گی وہ کرنے لگا۔ اور کنیش ٹمپل اسٹریٹ کے راؤ صرف تاریخ کا حصہ بن کر رہ جائیں گے۔

اتّی کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔ بلڈروں نے بچوں کو لبھانے کے لیے بڑی بڑی آفر دی ہوئی تھیں۔ اتّی نہیں جانتی تھیں کب تک وہ اس سب کا مقابلہ کر سکیں گی۔ سکون کی تلاش میں اتّی اپنی پسندیدہ جگہ جو کہ ناریل کے پیڑوں کے نیچے واقع تھی، چلی گئیں۔

انھوں نے سب طرف دیکھا اور شاید پہلی مرتبہ انھیں بے ترتیبی کا احساس ہوا۔ وہ مالی نہیں رکھ سکتے تھے۔ جب اور زیادہ نفع بخش کام موجود تھے تو اس کام پر کون آئے گا۔ مکان کی حالت بھی خاص خراب تھی۔ چھت ٹپک رہی تھی، دروازے ٹوٹ گئے تھے، دیواریں بغیر پلاسٹر کے تھیں غرض سب کچھ خراب ہو چکا تھا۔

اُن کے دماغ میں ایک آواز اُبھری "بیچ دو" "بیچ دو"۔

امّی نے بحث کی "نہیں" وہ اس گھر میں پورے ساٹھ سال گذار چکی تھیں۔ دُکھ اور سکھ دیکھے تھے۔ جینا اور مرنا ہوا تھا۔ وہ لوگ جو اُس کے لیے بے حد محترم تھے وہ ایسی جگہ رہ چکے تھے۔ اُس کا ماضی اس گھر سے وابستہ تھا۔

امّی بہت دیر تک اپنے آپ سے سوال جواب کرتی رہیں۔ اور آخر کار ایک فیصلہ پر پہنچ گئیں۔ امّی کھڑی ہو گئی۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہی تھا کہ ایک ناریل اوپر سے گرا اور امّی کو چوٹ لگی۔ خوش قسمتی سے ناریل بہت بڑا نہ تھا۔ لیکن چوٹ کا اثر امّی کے سر کے پچھلے حصّے پر موجود تھا۔ لیکن اس حادثہ نے امّی کی تمام اکڑ دور کر دی۔ اور وہ پھر بیٹھ گئیں۔ وہ دوبارہ اٹھیں اور گھر کے اندر داخل ہو گئیں۔ وہ صدر دروازے سے پھر باہر نکل گئیں۔ ایک گھنٹے بعد وہ واپس آئیں۔ وہ فرش پر چاروں خانے چت لیٹ گئیں۔ اُس کے اوپر تین چہرے اُس کو تشویش بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"تم کون ہو" امّی نے سب سے بڑی، ادھیڑ عمر کی عورت سے پوچھا جو کہ گلابی ساڑی پہنے تھی۔ "میں آپ کی بہو، ایلا ہوں، اُس نے ہلکے سے جواب دیا، "کیا آپ مجھے نہیں پہچانتیں"۔

امّی نے اچنبھے سے کہا، "بہو، کیا میری ایک بہو بھی ہے؟"

اُس نے دوسرے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ ایک دس سالہ لڑکا تھا۔ متوقع سوال کے جواب میں وہ بولا، "میں نیل، آپ کا پوتا ہوں۔ میں درجہ پانچ میں پڑھتا ہوں۔ ہمارا، یعنی آپ کا اور میرا ایک ہی کمرہ ہے"۔

"بہت خوب" امّی نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ اُس کا سر ہل رہا تھا۔ اب اُس نے تیسرے اور آخری چہرے کی طرف دیکھا۔ ایک جوان چہرہ، جس کے چہرے سے نافرمانی ٹپکتی تھی۔

"کیا میں تمہیں بھی جانتی ہوں"۔ امّی نے نرم لہجہ میں پوچھا۔

نہ جانے کیوں اس بے ڈھب سوال نے لڑکی کو پریشان کر دیا۔ اُس کا چہرہ سکڑ گیا۔ امّی نے کہیں دور گھورنا شروع کر دیا۔

"یہ سپنا، آپ کی پوتی ہے"، نیل نے اشارے سے بتایا۔ "وہ رو رہی ہے کیوں کہ اُس نے اپنے بال کٹوا لئے ہیں"، "جب کہ آپ نے منع کیا تھا"۔

"بکواس بند کرو" سپنا نیل پر چلائی۔

"بہت اچھے بال کٹے ہیں" امّی نے غیر متوقع طور پر تعریف کی۔ "تمہارے چہرے پر مناسب ہیں، مجھے اچھے لگے"۔

ماحول میں مکمل خاموشی تھی۔ ایلا نے خاموشی توڑی "اوہ خدا، وہ روتی ہوئی بولی۔

"میں ڈاکٹر کو بلاتی ہوں"۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ان کو اکیلا نہ چھوڑنا" اُس نے ہدایت کی۔

"وقتی طور پر یادداشت کا چلا جانا" ڈاکٹر نے کہا۔ "حافظہ ختم ہو جانا" کیا ان کو کسی طرح چوٹ لگی ہے۔ ان کے سَر کے پیچھے ناریل جیسی چوٹ کا نشان موجود ہے"۔

"کیا وہ پھر سے ٹھیک ہو جائیں گی" امّی کے لڑکوں نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں، اس میں چند دن لگ سکتے ہیں۔ ہم ۴۸ گھنٹے اُن کو دیکھ ریکھ میں رکھیں گے"۔ امّی کے بچے مطمئن ہو گئے۔ کتنا عجیب تھا کہ اپنی ماں سے اپنے آپ کو متعارف کرایا جائے۔ اُن کے خود کے لیے اس تجربے سے نکلنا آسان نہ تھا۔

دو دن بعد، امّی گھر واپس آ گئیں۔ اُن کو ابھی بھی ماضی کا کچھ یاد نہ تھا۔ پرانے ملنے جلنے والے آتے رہے اور اپنے آپ کو متعارف کراتے رہے۔ اور کچھ پرانے دشمن بھی۔ امّی کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ اچھا تھا۔

ایک کے بعد ایک ہر اصول جو امّی نے گھر میں رائج کیا تھا، توڑ دیا گیا۔ صبح سے شام تک گھر پاپ میوزیک سے گونجتا رہا۔ امّی اُتنی ہی خوش نظر آ رہی تھی جتنی کہ اُس کے پوتے پوتیاں۔ چند روز بعد گھر کے بڑے بہرہ پن اور سر درد کی شکایت کر رہے تھے، سوائے امّی کے۔

ٹی وی دن رات چل رہا تھا۔ بچے دیر تک سوتے رہتے اور اپنا ہوم ورک بھی پورا نہ کرتے۔

پورے خاندان نے گھر سے باہر ہی کھانا کھایا۔ ایک دن چائنیز، اگلے دن مُغلئی اور پھر ایک دن پزا۔ چوتھے دن وہ سب گھر میں ہی رہے۔

"بہت ہو گیا" ایلا نے اعلان کر دیا۔ "ہم اس طرح کی تیز زندگی کے عادی نہیں ہیں"۔ اُس نے میوزیک بند کر دیا وٹی وی بھی۔ اُس کے بعد وہ سب کے لیے کڑھی چاول بنانے باورچی خانے میں گئی۔

ایک صبح سب نے امّی کو باغیچہ میں پایا۔ وہ سوکھے پتوں کو جھاڑ و لگا رہی تھیں۔ اب وہ امّی سے اسی طرح کے بیوقوفی کے کاموں کی توقع کرتے تھے۔ انھوں نے نرمی سے پوچھا "امّی آپ کیا کر رہی ہیں"۔

"صفائی کر رہی ہوں"۔ انھوں نے کہا۔ اور ایک جھاڑی کو باہر نکالا۔ "تم بھی میرے ساتھ کام کیوں نہیں کرتے"؟

انھوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، کندھوں کو اُچکایا اور کام میں جٹ گئے۔ پھر چھت کی مرمت کی گئی، نئی نالیاں بنوائی گئیں۔ پورے گھر پر نیا پینٹ کیا گیا۔ اب یہ کافی اچھا لگنے لگا تھا۔ شہر کے ایک اخبار کا فوٹو گرافر فوٹو لینے آیا۔ اخبار میں مضمون چھپا۔

"شہر کے بہترین گھروں میں سے ایک"

بلڈرز بھی آئے۔ لیکن اس مرتبہ اجّی کے لڑکوں نے ہی انھیں واپس کر دیا۔ "ہم بیچ نہیں رہے"۔ انھوں نے کہا۔

وقت کے ساتھ ساتھ سب لوگ اجّی کی یادداشت جانے کے عادی ہو گئے تھے۔ ایک نئی اجّی۔ "کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے"۔

بلسپّا نے سوچا۔ وہ دودھ والا تھا جو پچھلے دس سال سے اس فیملی کو دودھ دے رہا تھا۔ وہ بھی اوروں کی طرح اجّی سے بہت ڈرتا تھا۔ ان کی یادداشت تو غضب کی تھی۔ دودھ کا تمام حساب اُن کے دماغ میں رہتا اور وہ پیسہ پیسہ کا حساب کرتیں۔

مہینے کی پہلی تاریخ کو بلسپّا نے کہا۔ "اجّی میرے آپ پر چھ سو روپیہ ہیں۔ اس میں اُس نے اصلی رقم سے پورے پچاس روپیہ کا اضافہ کر دیا تھا۔

اجّی کا ہاتھ جو پرس کے اندر تھا، وہیں رُک گیا۔ انھوں نے بلسپّا کی طرف دیکھا۔ "کیا" وہ کچھ اس طرح بولیں جیسے اچانک اُن کے سننے کی طاقت ختم ہو گئی ہو۔

"چھ سو روپیہ" دودھ والے نے اصرار کیا۔

اجّی کی آنکھیں غصّے سے لال ہو گئیں۔ انھوں نے دودھ والے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا "بلسپّا" وہ چلائیں۔

بیچارہ دودھ والا لڑکھڑا گیا۔

"اجّی...... آپ کو سب یاد ہے؟......وہ سرگوشی میں بولا۔

اجّی نے سر ہلایا

"مجھے افسوس ہے" بلسپّا معافی مانگتے ہوئے بولا۔ "غلطی ہو گئی۔ پانچ سو پچاس روپیہ"۔ اجّی نے اُسے رقم دے دی۔

اجّی خود بخود مسکرائیں۔ کسی کو معلوم نہ تھا، کیا ہوا تھا۔

لیکن وہ غلطی پر تھیں۔ نیل نے یہ سب کچھ دیکھا تھا۔

اجّی، نیل کو وہاں کھڑا دیکھ کر، بالکل اپنے پیچھے، گڑبڑا گئیں۔ تھوڑی دیر تک مکمل خاموشی رہی۔ نیل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس نے کیا دیکھا تھا۔

"اجّی! ہانپتے ہوئے بولا" آپ کو سب یاد ہے"۔

"ہاں" اجّی نے نرمی سے جواب دیا۔ "مجھے سب کچھ یاد ہے"۔ "ہر چیز"

انھوں نے سر ہلایا۔ نیل نے شبہ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا، کیا آپ واقعی اپنا حافظہ کھو بیٹھی تھیں"؟
"آپ ایکٹنگ کر رہی تھیں، ہے نا"؟

اگرچہ اتی اس سوال سے ذرا پریشان ہو گئیں۔ لیکن نیل نے اُن کی آنکھوں میں چمکتے ستارے دیکھے تھے۔

"میں چند گھنٹوں کے لیے اپنی یادداشت سے محروم ہو گئی تھی"۔ انھوں نے اعتراف کیا۔ "لیکن جب میں اسپتال میں اُٹھی تو میری یادداشت واپس آچکی تھی۔ میں نے کچھ دنوں کے لیے اسی طرح جینے کا سوچا خاص طور پر تم لوگوں کا برتاؤ دیکھ کر۔ یہ ایک اچھا موقع تھا کہ پچھلی چیزوں کو بھلا دیا جائے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے۔ میں نے دیکھا پرانی دشمنیاں دوستی میں بدل رہی ہیں۔ یہ ایک اچھا احساس تھا۔ ایک دوسرے کی غلطیوں کو بھلا دینا اور معاف کر دینا چاہیے اور جس قدر جلدی ایسا کیا جائے بہتر ہے۔ ہے نا؟" اور اب، نیل جاننا چاہتا تھا کہ کیا وہ سب کو بتائیں گی۔ "یہ تم پر منحصر ہے" اتّی نے کہا، "تمھاری کیا رائے ہے؟"۔ نیل نے چند لمحے سوچا "ہمیں اس راز کو راز ہی رکھنا چاہیے، وہ بولا۔

"کیا تمھاری رائے میں یہ اچھا خیال ہے"۔ "بہت بڑھیا"۔ اتّی مسکرا دیں۔ "تو یہ ہمارا راز ہے تمہارا اور میرا"۔

اور اب یہ آپ کا بھی۔

میرے پاپا کی بیوی

دیپا اگروال

"یہ نینا آنٹی ہیں" جیسے ہی میں نے دروازہ کھولا پاپا بولے۔

نینا آنٹی میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھیں، وہ کچھ بوکھلائی لگ رہی تھیں۔ لیکن وہ کیوں بوکھلا رہی ہیں، مجھے تعجب ہوا، بہر حال وہ مجھ سے کافی بڑی تھیں۔ وہ پاپا کی طرح لمبے قد کی تھیں۔ انھوں نے سُرخ رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی جس کا بورڈر آف وہایٹ تھا۔ اُن کے چھوٹے بال پیچھے کی طرف کیے ہوئے تھے۔ اور ساڑی کی ہی مناسبت سے انھوں نے ایک بڑی سرخ رنگ کی بندی بھی لگا رکھی تھی۔

وہ کون تھی؟ ایک ایسی رشتہ دار جس سے میں پہلے کبھی نہ ملی تھی یا میری ماں کی کوئی دوست جو اس سے پہلے کبھی ہمارے گھر نہ آئی تھیں؟ پاپا نے اُن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ دفتر میں میرے ساتھ کام کرتی ہیں"۔

دفتر! تو پھر گھر میں کیا کر رہی تھیں؟ اور وہ بھی اتوار کے روز۔ اچانک میرے دل میں ایک عجیب سا شک ہوا۔ کہیں پاپا آج گھر پر ہی رہ کر کام کرنے کی تو نہیں سوچ رہے جب کہ انھوں نے مجھ سے آج پکنک پر لے جانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔

"پاپا، میں نے فوراً احتجاج کیا"

پاپا نے سنجیدگی سے میری طرف دیکھا لیکن فوراً ہی اُن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، جو کہ بالکل مصنوعی تھی۔

اس سے میرے شک کو اور بھی تقویت ملی۔ "رچا کیا آنٹی کو بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی، ارے بھئی اُن کو پانی پلاؤ"۔

مجھے اُن کا یہ کہنا اچھا نہیں لگا۔ میں زور سے چیخنا چاہتی تھی۔ یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں تھی کہ اُنھیں آج مجھے باہر لے جانا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنا وعدہ توڑ دیا تھا۔ میں نے کسی طرح اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔

مجھے یہ دیکھ کر بے حد اطمینان ہوا کہ آنٹی نیتا کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اُن کا چہرہ پیلا اور کمزور نظر آرہا تھا۔ انھوں نے پاپا کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھا۔

پاپا میرے پیچھے پیچھے باورچی خانہ میں آگئے۔ "ہم پکنک پر ضرور چلیں گے، اگر تمہاری خفگی کی یہی وجہ ہے تو سُن لو"۔ انھوں نے سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

"ہاں، نیتا آنٹی بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔ میں چاہتا ہوں تم اُن سے اچھا سلوک کرو ورنہ وہ سوچیں گی تمہاری ماں نے تمہیں کچھ نہیں سکھایا......"۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میری ممی کا انتقال ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا۔ میں زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھی۔ مجھے یقین تھا میں حالات کا مقابلہ کر سکوں گی لیکن جب کبھی کوئی میری ماں کا ذکر کرتا تو میرا بے اختیار رونے کو جی کرتا۔ میں نے سوچا، اس وقت کا پاپا کا ایسا کہنا، میرے ساتھ بڑی زیادتی تھی۔ انھوں نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا۔ شاید وہ بغیر سوچے سمجھے ایسا بول گئے تھے کیوں کہ میں نے اُن کی تکلیف دیکھی تھی۔ انھوں نے مجھے پیار کیا اور رُندھی آواز میں بولے، "مجھے بے حد افسوس ہے، میرا مطلب ہرگز تمہیں تکلیف دینا نہیں تھا...... میں کبھی بھی ٹھیک ٹھیک کام نہیں کر سکتا"۔

مجھے یہ سن کر اور زیادہ تکلیف ہوئی۔ میں صرف اپنے ہی بارے میں سوچ رہی تھی، اُن کے بارے میں نہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسی وجہ ضرور رہی ہوگی تبھی تو انھوں نے نیتا آنٹی کو بھی ہمارے ساتھ پکنک پر لے جانے کے لیے کہا ہوگا۔ میں نے سوچا۔ میں کتنی بیوقوف ہوں، کس قدر جلد کسی نتیجہ پر پہنچ گئی کہ پکنک بغیر مجھ سے پوچھے رد کر دی گئی تھی۔ میں کوئی بچہ تو نہ تھی۔ میں بارہ سال کی لڑکی ہوں۔ اگلے سال میں نوجوانوں میں شامل ہو جاؤں گی۔ میں نے پاپا کی قمیص سے اپنی ناک پونچھی لیکن فوراً ہی نیتا آنٹی یاد آگئیں جو شاید حیران و پریشان ہوں گی کہ ہم دونوں اتنی دیر تک کیا کر رہے تھے۔ میں نے فوراً ہی پینے کے لیے کوئی مشروب نکالا اور مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے باہر نکل گئی۔

وہ صوفہ پر کچھ اُکھڑی اُکھڑی بیٹھی تھیں۔ میں نے اُنھیں مشروب پیش کیا اور پھر اپنی ماں کی طرح، جیسا کہ وہ پہلی مرتبہ کسی سے ملتے وقت بولتی تھیں، کہا۔ "مجھے بڑا اچھا لگ رہا ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ پکنک پر چل رہی ہیں"۔

اُن کا چہرہ ایک دم کھل اُٹھا۔ "مجھے بھی اتنا ہی اچھا لگ رہا ہے"۔ وہ بولیں اور اُس کے بعد انھوں نے ایک پیکٹ کھولتے ہوئے کہا، "میں نے سنا ہے تم پڑھنے کی بے حد شوقین ہو، میں تمہارے واسطے کچھ کتابیں لائی ہوں"۔

نسی ڈریوز(Nancy Drews)، سویٹ ویلیز(Sweet Valleys) اور کچھ ہندوستانی رائٹرز کی کتابیں۔ نہ معلوم وہ کس طرح سب کی سب میری پسند کی کتابیں لے آئی تھیں۔ ضرور، پاپا نے انھیں بتایا ہوگا۔ وہ کیوں مجھے خوش رکھنا چاہتی ہیں؟ اور وہ بھی اتنی بہت سی کتابیں، جب کہ ان میں سے چند ہی کافی تھیں۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک چاکلیٹ کا ڈبہ ساتھ لے آتیں۔ شک وشبہ کا احساس اتنے بڑے تحفہ کا مزہ ہی کرکرا کر رہا تھا۔

"ماں"، پاپا نے زور سے دادی کو آواز لگائی۔ "نیتا آئی ہے"

اس کا مطلب دادی اُن کے بارے میں پہلے ہی سے جانتی تھی! کیا چکر چل رہا ہے؟ نہیں مجھے اس طرح نہیں پھیلنا چاہیے۔ شاید پاپا مجھے بتانا بھول گئے ہوں۔ میں اُس وقت سو رہی تھی جب پاپا گھر سے گئے تھے۔ وہ مجھے کس طرح بتاتے؟

میں نے پکنک میں خوب مزے کرنے کی کوشش کی اور یہ سب میں نے ممی کے لیے کیا تاکہ پاپا یہ نہ کہہ سکیں کہ نیتا آنٹی کیا سوچیں گی کہ میری ماں نے مجھے کچھ نہیں سکھایا۔ گرچہ یہ مشکل کام تھا، واقعی مشکل، کیوں کہ جس قدر نیتا آنٹی میرے ساتھ ہنستی بولتی رہیں، مجھے اچھا نہیں لگا۔ شاید یا تو اس لیے کہ مجھے اُن کے آنے کے بارے میں پہلے سے معلوم نہ تھا یا اس لیے کہ جس انداز سے وہ پاپا کو دیکھ رہی تھیں، جیسے کے بہت گہرے دوست یا اس سے بھی زیادہ ہوں یا پاپا جس طرح انھیں دیکھ رہے تھے۔ میرا جی زور زور سے رونے کو چاہ رہا تھا اور یہ کہ اُن دونوں کو ماروں۔ میں ایسا کچھ نہ کر سکی۔ بہرحال میں کیسے اپنی ممی کو بے عزت کرا سکتی تھی؟

کبھی کبھار کسی ایسے شخص کے ساتھ جس کو آپ پسند بھی نہ کرتے ہوں، اچھا سلوک کا دکھاوا کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ایسا ہمیشہ کرنا پڑے، یہ بہت مشکل کام ہے۔

نیتا آنٹی کی ہمارے گھر میں آمد ورفت کافی بڑھ گئی تھی۔ وہ اکثر رات کے کھانے پر آتیں، ہمارے ساتھ فلم دیکھنے جاتیں۔ کئی بار وہ مجھے شاپنگ کرانے باہر لے گئیں بال بھی کٹوائے اور کبھی کبھی تو وہ بے وجہ بھی آجاتیں۔ دادی اُن کو بہت چاہنے لگی تھیں۔ پاپا تو پہلے ہی سے چاہتے تھے۔ لیکن صرف میں اُن سے اچھا بنتے بنتے اب پھٹنے کو تیار تھی، اُن کو برداشت نہیں کر پاتی تھی۔ جب کہ وہ اکثر میری بہت خوشامد کیا کرتی تھیں۔

ایک روز میں نے انھیں ممی کے فوٹو کو غور سے دیکھتے ہوئے پکڑ لیا جو کہ کافی بڑا تھا اور ڈرائنگ روم میں رکھا تھا۔ "تمہاری ممی بہت خوبصورت تھیں" وہ پیار سے بولیں۔ "بالکل تمہاری جیسی"۔

میں جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہی تھیں، کیوں کہ سبھی لوگ کہا کرتے تھے کہ میں پاپا جیسی لگتی ہوں۔

اس کے باوجود میں نے اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا۔ اُس وقت تک جب تک کہ میں نے پاپا کو دادی سے ہلکے ہلکے بات کرتے نہیں سنا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے وہاں ٹھٹک گئی شاید وہ کسی ایسی بات کے بارے میں بات کر رہے تھے، جس کو وہ مجھے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو میں اس کو ضرور جاننا چاہوں گی۔ میں چوہیا کی طرح خاموش

کھڑی ہو گئی اور اپنے کان اُن کی باتوں پر لگا دیے اور جو میں نے سنا..... "رچنا شاید اُسے پسند کرتی ہے" میں یہ سن کر جل گئی۔ میں نے سمجھ لیا وہ کس کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ اُن کے اگلے الفاظ نے تو مجھے برف کی طرح جما دیا۔ "وہ اُس کے لیے ایک اچھی ماں ثابت ہو گی......"۔

چند لمحوں کے لیے تو مجھے ایسا لگا جیسے میں پتھر بن گئی ہوں۔ اُس کے بعد میں ہلکے ہلکے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میرا دل ایک سرد گوشت کے ٹکڑے کے مانند میرے اندر موجود تھا۔ میرے کان بج رہے تھے۔ میں بھی ممی کی طرح مر جانا چاہتی تھی۔ مر جانا یا یہاں سے دور چلے جانا۔ مجھے پاپا سے نفرت ہو گئی، دادی سے بھی اور سب سے زیادہ تو نیتا آنٹی سے۔ گرم گرم آنسو میرے گالوں پر بہہ نکلے۔ مجھے دادی پکار رہی تھیں لیکن میں نے سنی ان سنی کر دی۔

مر جانا یا دور چلے جانا...... اچانک میرے دماغ میں ایک خیال کوند گیا۔ میں اپنی نانی کے پاس جا سکتی تھی۔ وہ میرے جذبات کو سمجھ سکیں گی۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی جہاں پر پہلے ہی میری ممی کو بدلنے کی بات چل رہی تھی۔ میرے لیے کوئی بھی اُن کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں اپنی نانی کے ساتھ رہ سکتی تھی۔ شاید مجھے اپنے راستے سے ہٹا کر، انھیں بھی اچھا لگے گا۔ مجھے یقین ہے نیتا آنٹی کو تو ایسا ہی لگے گا۔ خوش قسمتی سے میرے پاس کافی پیسے موجود تھے۔ میرے دیوالی کے پیسے، اور میرے برتھ ڈے کے بہت سے تحفے۔ عام طور پر پاپا ان سب کو میرے لیے بینک میں رکھ دیا کرتے تھے۔ لیکن کیوں کہ وہ پچھلے دنوں کافی مصروف رہے اس لیے اس مرتبہ بھول گئے۔ میں نے جلدی سے اپنے کپڑے ایک تھیلے میں رکھے۔ مجھے گاڑی کا وقت معلوم تھا جو کہ نانی کے شہر جاتی تھی۔ ہم ممی اور میں کئی بار آ جا چکے تھے۔

میں پچھلے دروازے سے خاموشی سے نکل گئی۔ کسی نے مجھے جاتے نہیں دیکھا۔ میں نے آسانی سے ایک ٹکٹ خریدا اور آرام سے ٹرین میں جا بیٹھی۔ ایک دو آدمیوں نے مجھے کچھ عجیب نظروں سے دیکھا۔ خوش قسمتی سے میں اپنی عمر سے زیادہ بڑی لگتی ہوں۔

"نانی" میں زور سے چلائی، جیسے ہی انھوں نے دروازہ کھولا، میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

انھوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں نے انھیں سب کچھ بتایا اور وہ آرام سے سنتی رہیں۔ مجھے تعجب ہوا کیوں کہ انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ جب میں نے کہا کہ وہ لوگ ممی کا بدل لانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

"بے شک تم میرے پاس رہ سکتی ہو۔ جب تک تمہارا دل چاہے تم میرے پاس رہو"۔

اُس کے بعد وہ میرے واسطے کچھ کھانے کا انتظام کرنے لگیں۔ میں سکون سے تھی اور نیند بھی آ رہی تھی۔ میں سو جانے والی ہی تھی کہ اچانک مجھے ایک خیال نے جھنجھوڑ دیا۔ مجھے پاپا کے لیے ایک خط چھوڑ آنا چاہیے تھا۔ انھیں بتا دیتی کہ میں کیا کرنے والی تھی۔ وہ میرے لیے پاگل ہو گئے ہوں گے اور بے حد پریشان ہوں گے کہ میں کہاں چلی گئی تھی۔ نہیں وہ خوش ہوں گے کہ چلو مجھ سے چھٹکارا ملا کیوں کہ وہ نیتا آنٹی سے اب شادی کرنا چاہتے تھے۔ میں

خیالات کا تانا بانا بنتی رہی۔ پھر میں نے نانی سے پوچھا۔ "کیا خیال ہے...... کیا آپ پاپا کو میرے بارے میں بتائیں گی۔ میں پہلے ہی انھیں بتا چکی ہوں"۔ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولیں۔ "میں جانتی تھی، وہ تمہارے لیے بے حد پریشان ہوں گے"۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی"، میں نے طنزاً کہا۔

"لیکن میں کہہ سکتی ہوں"، انھوں نے سختی سے کہا۔ "تم اُن کے لیے دنیا میں سب سے زیادہ قیمتی شخصیت ہو، خاص طور پر تمہاری ماں کے گذر جانے کے بعد۔ اور اگر یہ نیتا آنٹی ایسی ہی خراب عورت ہیں تو تمہارے پاپا کو زیادہ دنوں تک بیوقوف نہیں بنا سکتیں"۔

میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں نے ایسا تو ہرگز نہیں کہا کہ وہ ایک بہت خراب عورت ہیں"۔ "لیکن تم نے کہا تم اُن سے نفرت کرتی ہو، اور اس لیے میں نے سوچا کہ وہ واقعی بہت خراب ہوں گی، کیوں کہ تم تو اتنی پیاری بچی ہو"۔

"ہاں میں نیتا آنٹی سے نفرت کرتی ہوں، لیکن کیا وہ اتنی خراب عورت تھیں"؟

حقیقت میں وہ اتنی خراب عورت نہ تھیں۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہمیشہ اچھی طرح برتاؤ نہیں کرتی تھی۔ صرف اُس وقت جب پاپا اُس کے پاس ہوتے۔ میں نے شاپنگ کرتے وقت انھیں پریشان کر ڈالا تھا۔ کسی چیز پر بھی میں فیصلہ نہیں کرتی تھی۔ اُن کی ہر بات کو میں غلط قرار دے دیتی۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ صبر کیا اور مسکراتی رہیں۔ ایسا ہی کچھ بال کٹواتے وقت ہوا۔ میں نے بہت پریشان کیا لیکن وہ ہمیشہ کی طرح پُر سکون رہیں۔ اگر میں اُن کی جگہ ہوتی تو اپنے آپ کو ایک زوردار چپت لگاتی۔

"نہیں" میں نے آہستہ سے کہا، "وہ اچھی ہیں، وہ واقعی بہت اچھی ہیں"۔

میں نے اُن کے بارے میں بے حد سخت الفاظ استعمال کیے تھے۔ لیکن ممی نے مجھے انصاف کا راستہ سکھایا تھا۔ میں ہرگز اُن کو بے عزت نہیں کر سکتی۔

"کیا تم نے کبھی اپنے پاپا کے بارے میں سوچا"، نانی نے پوچھا۔ "وہ ایک جوان شخص ہیں۔ تم بڑی ہو کر اپنے گھر چلی جاؤ گی۔ انھیں تمام زندگی تنہا ہی گذارنی پڑے گی"۔

میں چونک گئی، میں نے اس بارے میں تو سوچا ہی نہ تھا۔ میں نے پاپا کو ایک تنہا بوڑھے آدمی کی طرح محسوس کیا، مجھے اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔

"کوئی بھی میری ممی کی جگہ نہیں لے سکتا"، میں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"بالکل، اُس کو ایسا سمجھنا بھی نہیں چاہیے۔ اُس کا اپنا مقام ہونا چاہیے اور تمھیں اس کام میں اُس کی مدد کرنا چاہیے"۔

"میں مدد کروں؟، کون مجھ سے پوچھتا ہے؟"

"بیوقوف لڑکی، کیا تم نہیں جانتی تمہارے پاپا تمہاری مرضی کے بغیر کوئی بھی کام نہیں کرتے!"

واقعی، میں بیوقوف ہوں، میں نے اس بات کو محسوس نہیں کیا جب تک کہ اگلے دن پاپا نہیں آگئے۔ وہ مجھے لپٹا کر پیار کرتے رہے، وہ رو رہے تھے، میرے پاپا رو رہے تھے۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا، میں اندر سے ٹوٹ گئی تھی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا"؟ انھوں نے مجھ سے پوچھا۔ "تم جانتی ہو میں پریشانی میں بالکل پاگل ہو جاتا ہوں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ تم مجھ سے دور چلی گئی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں میری زندگی میں تم سے زیادہ اہم اور کوئی بھی نہیں ہے"۔

"نیتا آنٹی بھی نہیں"؟ میں پوچھنا چاہتی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو روک لیا۔ شاید ایسی کوئی بات ممی کبھی نہ پوچھتیں۔ وہ کیا کہتیں اگر وہ میری جگہ ہوتیں۔ شاید ہرگز نہیں۔ مجھے اس مسئلہ کو خود ہی حل کرنا چاہیے۔

میں نے پاپا سے کہا، "پاپا مجھے بے حد افسوس ہے۔ میں شاید دنیا کی بیوقوف ترین لڑکی ہوں۔ میں کبھی بھی آپ کو دُکھ دینا نہیں چاہتی تھی"۔

پاپا نے ایک بار پھر مجھے لپٹا لیا۔ اُن کے داڑھی کے سخت بال مجھے چبھ رہے تھے۔ شاید انھوں نے شیو بھی نہیں کیا تھا۔

"اور پاپا"، میں بولتی گئی، "میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہو......"

"کیا"؟ وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ "کوئی بھی ایسی چیز جس سے آپ خوش ہو جائیں......"۔

"میں چاہتی ہوں کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو آپ نیتا آنٹی سے شادی کرلیں"۔ اُن کے چہرے پر میں نے اطمینان کی جھلک دیکھی۔ میں جانتی تھی کہ میری ممی جہاں کہیں بھی ہوں گی، مجھ پر فخر کریں گی۔ میں نے اپنی ذمہ داری اچھی طرح سمجھ لی تھی۔
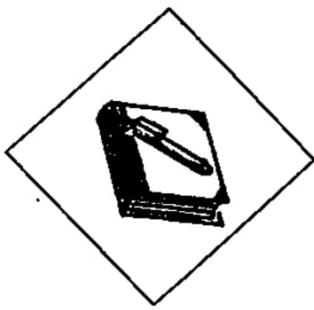
ذہنی لڑائی

وندنا کماری جینا

زوش ایک خاموش طبیعت لڑکا تھا جو دہلی کے ایک مشہور اسکول میں درجہ نو میں پڑھتا تھا۔ چھوٹا اور کمزور، آنکھوں پر موٹا چشمہ لیکن پڑھنے کا بے حد شوقین، یہی وجہ تھی کہ وہ کلاس میں عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ ایک ذہین اور محنتی لڑکا تھا اور اُس کو اُس کی محنت کا پھل بھی ملا تھا۔ جب سے وہ اس اسکول میں داخل ہوا تھا، وہ متواتر کلاس میں اوّل آرہا تھا۔ جو کوئی بھی اُس کی کلاس میں آیا اور اُس نے اُس سے آگے بڑھنے کی کوشش کی اُسے سوائے مایوسی کے کچھ نہ ملا۔ زوش اپنی پڑھائی کو اس قدر سنجیدگی سے لیتا تھا کہ اُس کے پاس کھیل اور دوسرے مشاغل کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ وہ ان سب چیزوں کو وقت کی بربادی سمجھتا تھا۔ اُس کے زیادہ تر ساتھی اُس سے بے حد متاثر تھے، خاص طور پر اُس کا سب سے اچھا دوست، آدیش، جس کے لیے حساب کا معمولی سا سوال کرنا بھی دشوار کام تھا زوش کو اُس کے ٹیچرز بہت پیار کرتے تھے اور اپنے والدین کا بھی لاڈلا تھا۔ زندگی بہت مزے دار تھی مثل جنت کی۔

اُس کی جنت میں البتہ ایک لڑکے کی شکل میں، ایک سانپ گھس آیا تھا۔ وِرون وہ روِش کا ہر لحاظ سے بالکل اُلٹ تھا۔ اگرچہ وہ صرف چودہ سال کا تھا اُس کی لمبائی پانچ فٹ آٹھ انچ تھی۔ وہ ایک تنومند ورزش کار تھا۔ پہلے ہی دن اُس کی اسپورٹس کی صلاحیت سب پر آشکار ہو گئی تھی جب وہ ۴۰۰ میٹر کی ریس میں آرام سے دوڑا اور اوّل آیا۔ وہ ایک بہترین فٹ بالر بھی تھا اور ساتھ ساتھ بہترین تیراک۔

رَوش اُس سے متاثر تھا۔ کیوں کہ اسپورٹس میں وہ خود نااہل تھا۔ اس لیے اُس کا رَوّیہ اُس کے ساتھ بہت اچھا ہوتا تھا جو اس میں ماہر ہوتا۔ بہر حال روش کا میدان تو پڑھنا لکھنا تھا نہ کہ کھیل کود۔

اسکول میں تقریری مقابلے کا اعلان ہوا، رَوش کو کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا لیکن اچانک ورون نے مقابلے میں حصہ لینے کا ارادہ کر لیا۔ روش نے کبھی بھی تقریری مقابلوں میں حصہ نہیں لیا تھا کیوں کہ وہ عادتاً شرمیلا تھا۔ اُسے ورون سے جلن سی ہو رہی تھی جو اسٹیج پر اُن طالب علموں کی دھجیاں بکھیر رہا تھا جنہوں نے اس عنوان کے حق میں بحث کی تھی کہ "زیادہ آزادی بچے کو خراب کر دیتی ہے"۔ اُس نے دلیل دی کہ آزادی اُس کے برعکس بچے کو احساسِ ذمہ داری کا سبق دیتی ہے اس کے علاوہ بچہ خود پر بھروسہ کرنے لگتا ہے، دراصل آزادی رحمت ہے نہ کہ زحمت۔ ورون نے مقابلے میں بڑی نہرو میموریل ٹرافی جیت لی۔ روش مطمئن تھا کہ جب وہ پوری نویں کلاس میں اوّل پوزیشن حاصل کرے گا اور انعام جیتے گا، وہ دن اُس کا ہو گا۔

رَوش کو اس وقت شدید صدمہ پہنچا جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ ورون پڑھائی میں بھی بہت آگے ہے۔ حالاں کہ وہ ایک لاپرواہ لڑکا تھا جس نے کبھی بھی اپنے ٹیسٹوں کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ لیکن جلد ہی وہ اوّل پوزیشن حاصل کرنے کے لیے محنت کرنے لگا۔ پہلی مرتبہ ورون نے روش کے مقابلے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ روش کو یقین تھا کہ ورون نے ضرور بے ایمانی کی تھی۔ روش نے اپنے دوست آدیش سے بھی اس بارے میں کہا جس نے دوسرے کئی دوستوں میں بھی یہ بات پھیلادی۔ لیکن کسی نے بھی زیادہ دنوں تک اس کی بات پر یقین نہیں کیا خاص طور پر اُس وقت جب ورون نے کلاس میں ایک مشکل سوال بآسانی حل کر دیا۔ جس کے حل کرنے میں خود کلاس ٹیچر اور روش ناکام ہو گئے تھے۔ "میرا بھی وقت آئے گا"، روش نے اپنے آپ سے کہا۔

اُسے لگا وہ وقت آ گیا ہے جب سالانہ مضمون نگاری کا مقابلہ شروع ہوا۔ مضمون کا عنوان پہلے بتا دیا گیا تھا لیکن بچوں کو یہ مضمون کلاس میں ہی لکھنا تھا۔ اسی عنوان پر ہر کلاس کے بچوں نے لکھا اور ہر کلاس کا جو بہترین مضمون تھا اس کو انعام کے لیے بنائی گئی فہرست میں شامل کیا گیا۔ روش اس سے پہلے بہترین مضامین لکھ چکا تھا اور کتنے ہی انعامات جیت چکا تھا۔ اسے اس مرتبہ بھی یقین تھا کہ وہ کامیابی حاصل کرے گا۔

اگلے روز جب ٹیچر کلاس میں آئیں، انھوں نے کہا، "مجھے اس کلاس سے ایک بہترین مضمون کو انتخاب کرنا ہے۔ اگر چہ میں نے ابھی تک سارے مضامین نہیں پڑھے ہیں، پھر بھی میرے خیال میں ورون کا مضمون سب سے اچھا ہو گا"۔

روشن یہ سن کر ششدر رہ گیا۔ کلاس ٹیچر نے تو اُس کے مضمون کے چُنے جانے کے امکان کی تک کی بات نہیں کی۔

جب وہ کلاس ورک کی کاپیاں، ٹیچر ڈیسک پر رکھنے، اسٹاف روم گیا۔ اُس نے مقابلے کے مضامین کو وہاں رکھتے

دیکھا۔ اُس کے اندر کے شیطان نے اپنا گھناؤنا سر اٹھایا اس سے پہلے کہ وہ یہ احساس کرتا کہ وہ کیا کرنے جارہا ہے، اُس نے ورون کا مضمون نکال لیا اور اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ خوف سے لرزنے لگا۔ اگر کسی نے اُسے ایسا کرتے دیکھ لیا ہوگا تو کیا ہوگا۔ اب اُسے ان پھٹے کاغذوں کا کیا کرنا چاہیے؟ وہ فوراً ٹوائلیٹ میں گھس گیا اور سب کو فلش کر دیا۔ اس کو کچھ اطمینان ہوا لیکن جس وقت وہ کلاس روم میں دوبارہ داخل ہوا، اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

"روش کیا بات ہے؟ کیا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے"۔ ورون نے پریشانی سے پوچھا۔

"نہیں" روش ہلکے سے بولا، وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھا۔ اُس کے اندر کا شیطان ایک بار پھر اُکسانے لگا، "اگر ورون راستے سے ہٹ جائے تو پھر سے وہ سب سے آگے ہوگا"۔

اگلے روز ٹیچر کو مضمون کے ضائع ہونے کا پتہ لگا اور بے حد تلاش کرنے کے باوجود بھی مضمون نہ ملا۔ "اگر مضمون نہیں ملا تو میں اس کلاس سے ایک بھی مضمون نہیں بھیجوں گی" ٹیچر نے دھمکی دی۔

ورون نے اس مسئلے کا حل تلاش کر لیا۔ اگرچہ یہ برمحل مضمون لکھنے کا مقابلہ تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ اپنے مضمون کو دوبارہ لکھ سکتا ہے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں اُس نے لکھ دیا۔

"تم نے ایک دم کیسے لکھ لیا"، ٹیچر نے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میڈم میں شاید خوش قسمت ہوں"، اُس نے انکساری سے کہا، "میری یادداشت فوٹوگرافک ہے"۔

روش غصے سے پاگل ہو گیا۔ جب ورون نے ٹرافی وصول کی روش نے محسوس کیا کہ یہ اُس کا حق تھا جو کہ ورون نے غصب کر لیا ہے۔ وہ اپنی جلن پر قابو نہ پاسکا۔ امتحانات قریب تھے۔ اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ اس کو تاریخ اور جغرافیہ یاد کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے جب کہ ورون ایک ہی دفعہ میں یاد کر لیتا۔

اور اُس کو کھیلنے، پڑھنے اور کمپیوٹر سیکھنے کے لیے کافی وقت مل جاتا۔ امتحانات سے ایک ہفتے قبل اُس نے ایک جگہ ورون کا جانا پہچانا بستہ رکھا دیکھا، اُس کے اندر کی جلن لوٹ آئی۔ اُس نے اُس کے بیگ سے اُس کے سارے کاغذ نوٹ، کاپیاں نکال لیں اور اُن سب کو چھپا دیا۔

ورون کو جلد ہی اپنے بستہ کے کھو جانے کا پتہ چل گیا۔ اس نے کافی شور مچایا۔ آخر کار بستہ باتھ روم میں مل گیا لیکن اُس میں سے تمام کاپیاں، کتابیں غائب تھیں ورون کو رونا آ گیا۔

وہ اتنا اچھا لڑکا ہے۔ کون اُس کا دشمن ہو سکتا ہے؟ ٹیچر نے تعجب کا اظہار کیا۔ کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔
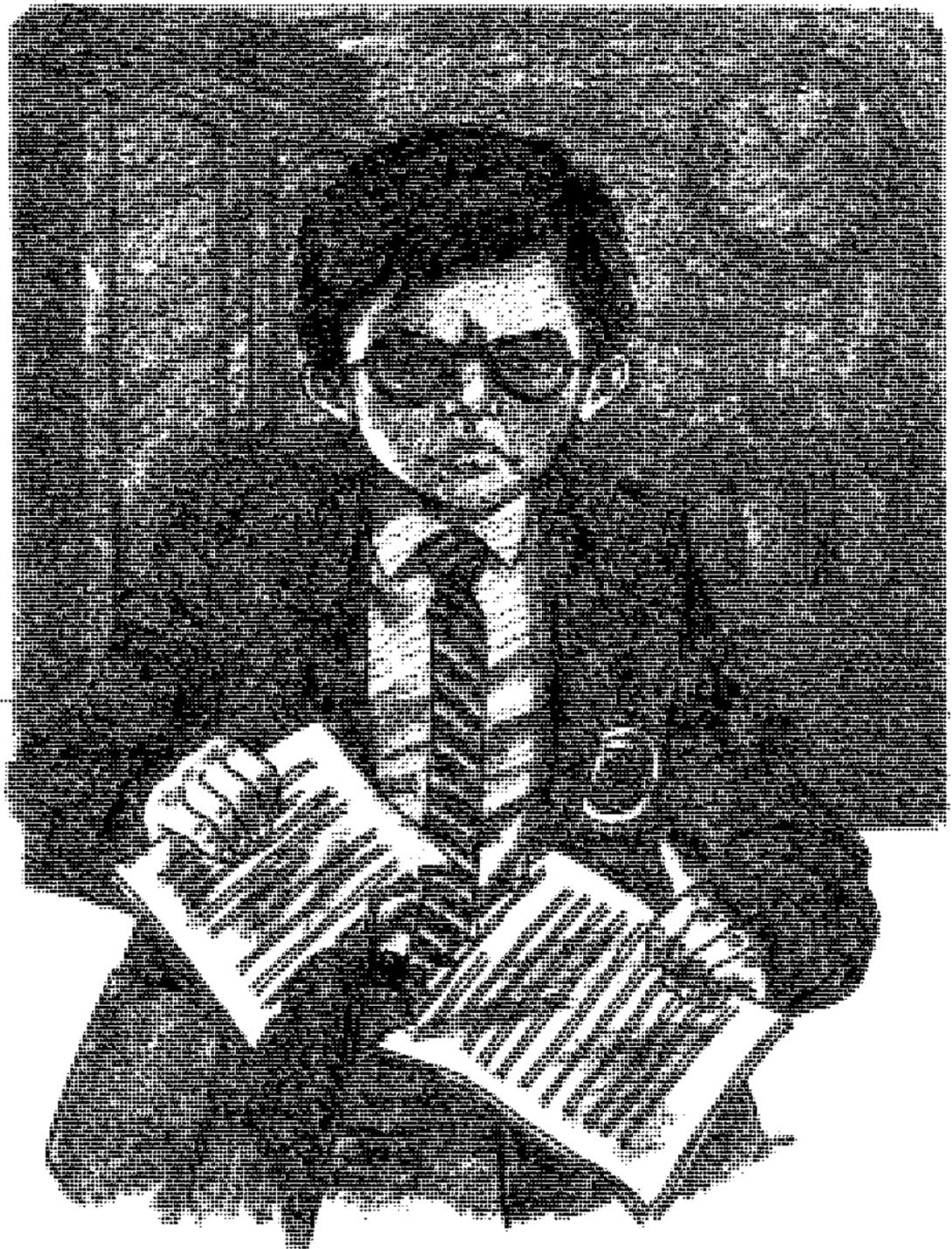
اگلے دن سے ورون نے اسکول آنا چھوڑ دیا۔ شاید وہ اپنی کتابوں کا پیوں کے نقصان پر آنسو بہا رہا ہو۔ روش نے سوچا۔ اب دیکھنا ہے کس طرح اس کی فوٹوگرافک یادداشت اُس کی مدد کو آتی ہے۔ جب اگلے روز بھی وہ اسکول نہیں آیا، روش کو گھبراہٹ شروع ہو گئی۔ تیسرے دن تو وہ ذہنی اذیت سے اُبل پڑا۔ اُس نے اپنے خیالوں میں ورون کو روتے پیٹتے غم میں نڈھال دیکھا۔ وہ اس قابل نہیں کہ درجہ نہم کا امتحان دے سکے اور مرنے والا ہے۔ وہ ورون کو مرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ حقیقت میں اُس نے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ ورون ایک اچھا مخلص لڑکا ہے۔ یہ خود اُس کی اپنی جلن اور حسد ہے جس کی وجہ سے ورون اس کو شیطان نظر آتا تھا۔

روش نے ورون کے گھر جانے کا فیصلہ کیا اور یہ بھی کہ وہ اپنے ساتھ اپنے نوٹ بھی لے کر جائے گا۔ لیکن ورون کا گھر کافی دور تھا۔ وہ صرف اپنے ماں باپ کے ہمراہ وہاں جا سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ اس کو اپنے ماں باپ کو سب کچھ بتانا پڑے گا۔ اُسے یقین تھا کہ یہ سب سن کر اس کے ماں باپ بہت ناراض ہوں گے۔ لیکن اگر وہ ورون کو زندہ و سلامت دیکھنا چاہتا تھا تو ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ یا ورون کے ماں باپ یا اپنے اسکول کی جانب سے ہر قسم کی سزا کے لیے تیار تھا۔ وہ ایک معصوم بچے کو مرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

جب اُس نے اپنے ماں باپ کو یہ سب بتایا۔ انھوں نے پوری توجہ سے سنا اور صرف اتنا کہا "ہمیں سب سے پہلے ورون کو جا کر دیکھنا چاہیے"۔

جب وہ ورون کے گھر پہنچے، وہ کہیں نظر نہ آیا لیکن اُس کے ماں باپ گھر پر ہی تھے۔

"میرا بیٹا آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے" روش کے چاچی نے کہا۔

روش نے سارا سچ اُگل دیا کہ وہ کس طرح محسوس کر رہا تھا کیوں کہ ورون نے اُس کا تخت چھین لیا تھا۔ اسی لیے اُس نے اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ "ورون کہاں ہے" اُس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کیوں کہ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بخار میں لت پت بستر میں پڑا ہو گا۔

اُس کو پہلے سے ہی یہ ڈر تھا کہ اُس کے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں نے اُس کے نوٹس کی پہلے ہی فوٹو کاپیاں کروا دی تھیں،" اُس کے چاچی نے ہنستے ہوئے کہا۔

اُسی وقت ورون کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کمزور اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

ورون کو شاید پہلے ہی سے احساس تھا کہ وہی اصل مجرم تھا۔ یہ اُس کا بڑپّن تھا کہ اُس نے آج تک اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس پر بھی اس نے کہا، اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بڑی ہمت کا کام ہے۔ شاید میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسا نہ کر پاتا۔

مجھے اس میں شک تھا کہ تم اتنا نیچے گر سکتے تھے۔ روش نے خاموشی سے سوچا۔ تم حقیقت میں ایک اسپورٹس مین ہو۔

تم کافی تھکے لگ رہے ہو۔ روش کی ماں جی نے ورون کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔

"وہ بہت محنت کر رہا ہے، اس کی ماں جی بولیں۔

لیکن اس کی تو فوٹوگرافیک یادداشت ہے، روش نے ٹوکا۔

"فوٹوگرافک، بالکل نہیں۔ تم سے کس نے کہا؟" ورون نے پوچھا۔

"پھر تم نے اپنے مضمون کو کس طرح دوبارہ ویسا کا ویسا ہی لکھ لیا تھا؟" روش نے سوال کیا۔

"بہت آسان ہے، ہمیں موضوع تو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ میں نے اس کو اچھی طرح یاد کر لیا" ورون نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

تم بہت سی مختلف چیزوں میں کس طرح مہارت حاصل کر لیتے ہو؟ روش کی ماں جی نے سوال کیا۔

میرا خیال ہے کہ پڑھنے کا وقت اور کھیلنے کا وقت الگ الگ ہے۔

"اور ورون دونوں کام آسانی سے کر لیتا ہے" ،اس کی ماں جی نے کہا۔

"کھیلنے کا شوق ورون کو مجھ سے ملا ہے"۔ ورون کے پتا جی نے شیخی ماری۔ میں اسپورٹس میں چمپئن تھا"۔

روش کو دلی راحت ملی۔ ورون میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔ وہ ایک مقابلے کی صلاحیت رکھنے والا لڑکا تھا۔ اس جیسے لڑکے کے ساتھ مقابلہ کرنا کتنا دلچسپ ہوگا۔

وہ واقعی مقابلہ کرنے لائق ہے۔ ایسا ہی لڑکا ایک اچھا دوست بن سکتا ہے۔

اُس نے سوچا، پوری کلاس کو کس قدر تعجب ہوگا جب وہ دونوں امتحان دینے دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح جائیں گے۔ دوسرے نمبر پر آنے کا جو دل میں ڈر تھا وہ نکل چکا تھا۔ اس کے برعکس اپنی صلاحیت کو ایک باصلاحیت مخالف کے سامنے پیش کرنا، ایک بڑا چیلنج تھا۔

شال

لتا کاکو

"من جری! ہائے من جری" بچوں نے آواز لگائی، "تمہارا رام پرساد کہاں ہے" وہ سب زور سے ہنسنے اور قہقہے لگانے لگے اور من جری کو پریشان کرنے لگے جو گاؤں سے باہر جا رہی تھی۔

عام طور پر من جری کو کوئی بھی پریشان نہیں کرتا تھا جو ایک بے ضرر دیوانی لڑکی تھی۔ گاؤں کے بڑے اُس پر مہربان تھے اور اُس کو پورے گاؤں کی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ اکثر بچے اُس کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ لیکن آج ایک نیا بچہ جو بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے، سب بچوں کے ساتھ من جری کو چڑھانے اور چھیڑنے میں پیش پیش تھا۔

من جری نے حیرت سے ان بچوں کی طرف دیکھا جو اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ "رام پرساد"! "میرا رام پرساد"؟ "کیا تم نے اُسے دیکھا ہے؟ اس کو سردی لگ رہی ہوگی" اس نے پاگلوں کی طرح سب طرف دیکھا اور اُس کا دھول سے بھرا چہرہ غم سے نڈھال ہو گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے۔

اُس کو روتا دیکھ کر بچے خاموش ہو گئے۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموشی سے کھڑے رہے اور پھر آہستہ آہستہ وہاں سے کھسک گئے۔

سورج چند جو نزدیک کی ایک دوکان سے یہ سب نظارہ دیکھ رہا تھا، بھاگ کر من جری کے پاس آ پہنچا۔

اس وقت تک من جری کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا اور اب وہ اس کے کپڑوں میں جذب ہو رہے تھے۔ "رام پرساد"، وہ روتی ہوئی بولی۔

سورج چند نے من جری کی پھٹی ہوئی شال اُس کے کندھوں پر ڈال دی اور اس کو دلاسا دیتے ہوئے بولا، "شاید رام پرساد پاس کی نہر سے پانی پینے گیا ہو۔ تم خود کیوں نہیں جا کر دیکھ لیتیں"؟ "اور وہاں پر اپنے آپ کو بھی صاف کر لینا، ٹھیک ہے نا؟"

من جری اب کچھ مطمئن لگ رہی تھی، اُس نے اپنا سر ہلایا اور نہر کی طرف چل دی۔ ہوا میں ابھی بھی خنکی باقی تھی جب کہ جاڑا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ من جری نے اپنی شال اور اچھی طرح لپیٹ لی، شال اُس کو اس قدر پسند تھی کہ شاید ہی کبھی وہ شال کے بغیر دکھائی دی ہو۔

ہمیشہ کی طرح، کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پھول اور ندی کو دیکھ کر وہ اپنی تکلیف ہی بھول گئی۔ وہ نہر کے کنارے لمبی لمبی لیٹ گئی اور بے خیالی میں پیر سے پانی کی چھینٹیں اڑانے لگی۔

تھوڑی ہی دیر میں من جری دور سے آنے والی آوازوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اُن آوازوں کی طرف چلنے لگی۔ وہ چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں سڑک ندی سے جا ملتی تھی۔ یہی وہ نقطہ تھا جہاں یہ گاؤں بقیہ دنیا سے ملتا تھا۔

جھاڑیوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے من جری نے لڑکے لڑکیوں کے ایک گروہ کو دیکھا جو ایک بڑی گیند سے کھیل رہے تھے۔ اُن کے پہناوے سے لگتا تھا کہ وہ اس کے گاؤں کے رہنے والے نہ تھے۔ پاس کھڑی سائیکلیں بتا رہی تھیں کہ وہ کس طرح یہاں تک پہنچے تھے۔ کچھ ٹوکریاں اور کچھ ڈبے پاس ہی بچھی دری پر رکھے تھے۔

من جری ابھی بڑے اشتیاق سے دیکھ ہی رہی تھی کہ لڑکے لڑکیاں دری پر ٹوکریوں کے ارد گرد آ کر بیٹھ گئے۔ ایک کے بعد ایک ٹوکری کھولی گئی اور کھانے کا سامان باہر نکال لیا گیا۔

کھانا دیکھ کر من جری کے منہ میں پانی آ گیا۔ اُس نے بہت دیر سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کھانا دیکھتے ہی اُسے زوروں سے بھوک لگنے لگی۔ وہ اُن لڑکے لڑکیوں کے پاس پہنچ گئی۔ وہ سب ایک دم خاموش ہو گئے اور سب کے سب اُسے اچنبھے سے دیکھنے لگے۔

"تمھیں کیا چاہیے" اُن میں سے ایک لڑکے نے سوال کیا۔

من جری نے فوراً اپنا ہاتھ پھیلا دیا "میں بہت بھوکی ہوں" اُس نے صفائی سے کہہ دیا۔ لڑکے نے اس کے بے ترتیب

الجھے بالوں کی طرف دیکھا جو گندے کپڑے پہنے ہوئے اور ننگے پاؤں تھی۔ اُسے یہ دیکھ کر اچھا نہیں لگا "یہاں سے جاؤ" اُس نے اُسے اشارہ کیا۔

مَن جری وہیں کھڑی رہی "مجھے کچھ کھانے کو دو" اُس نے فریاد کی۔

لڑکیاں سہم سی گئی تھیں۔ اُن میں سے ایک نے فوراً کچھ سینڈوچ اٹھائے اور اس کی طرف اچھال دیے۔

من جری نے انھیں فوراً پکڑ لیا اور کھانے لگی۔ "دور" اُس نے زور سے آواز لگائی۔

لڑکوں کو اس طرح مانگنا ناگوار لگا اور انھوں نے اُسے دھمکایا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی اور پھر پیچھے چلی گئی۔ وہ ایک بار پھر جھاڑیوں کی آڑ سے اُنھیں دیکھنے لگی جب تک کہ اُن کا کھانا ختم نہ ہوگیا۔ کھانا ختم ہوتے ہی اُس کی دلچسپی بھی ختم ہوگئی اور وہ واپس ہونے لگی۔

ایک بار پھر وہ پانی کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اس نے اپنی چیتھڑے لگی شال اُتار دی کنارے پر ذرا سی اونچی جگہ پر بہت احتیاط سے رکھ دی اور کیچڑ میں گھس گئی جو اس کے گھٹنوں تک آرہی تھی۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ من جری کو ٹھنڈا پانی اچھا لگ رہا تھا وہ ہر طرف چھینٹے اڑا رہی تھی۔

"رام پرساد، یہاں کتنا اچھا لگ رہا ہے" وہ بولی۔ "تمہیں بھی اچھا لگا، ہے نا"؟

"تھوڑی دیر میں یہ اور زیادہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ لیکن تم پرواہ نہ کرنا۔ میرے پاس شال ہے ہم اس کو اپنے چاروں طرف لپیٹ لیں گے اور ہمیں بالکل ٹھنڈ نہیں لگے گی"۔ کئی مرتبہ اس نے پانی اپنے ہاتھوں میں بھرا اور کسی طرف پھینک دیا اور پھر بہت زور سے قہقہہ لگایا۔

تھوڑے فاصلے پر لڑکے اور لڑکیاں ابھی تک کھیل رہے تھے۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے تبھی رنجیت نے آواز لگائی، "دوستو، اب چلا جائے"؟

کھلاڑیوں نے گھڑیوں کی طرف دیکھا اور سب نے یہی فیصلہ کیا کہ اب واپس چلا جائے۔ لڑکوں نے چیزیں اکٹھا کرنا شروع کیں اور لڑکیوں کو دیں جنھوں نے سلیقہ سے ٹوکریوں میں رکھ دیا۔ سائیکلوں کے کیریئر پر ان کو رکھ کر باندھا جاتا تھا۔

اچانک، امیت نے کہا، "کسی نے اس ٹوکری کی رسّی دیکھی ہے، مجھے مل نہیں رہی"۔ "نہیں ہمیں تو معلوم نہیں"۔ کئی نے جواب دیا۔

"مونٹی، ریلو، ڈولی، بھئی رسّی تلاش کرنے میں میری مدد کرو۔ ورنہ میں اس کو سائیکل پر کس طرح باندھوں گا"۔

امیت نے اپنے دوستوں سے درخواست کی۔

"یہیں آس پاس تلاش کرنا چاہیے، شاید ٹوکری باندھنے کے لیے اور چیز ہی مل جائے"۔ کسی نے رائے دی۔

دو، دو اور تین تین مل کر انھوں نے تلاش شروع کر دی۔

"اس کے بارے میں کیا خیال ہے" کسی نے مذاق کرتے ہوئے ایک لمبی سے ڈنڈی دکھائی۔ بھئی واہ خوب مذاق ہے، امیت نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"جلدی تلاش کرو" ڈولی نے منت کی مجھے اندھیرا ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ جانا چاہیے۔ رنجیت ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنے ساتھیوں سے دور ہو گیا اور ندی کی طرف نکل آیا جہاں من جری پانی سے کھیل رہی تھی۔ چیتھڑا ہوئی پیلے رنگ کی شال پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس نے سوچا یہ ٹھیک رہے گی۔

رنجیت نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی اور کندھوں کو اُچکایا۔ اس کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ اس کے دوست، اس کے کپڑوں اور جوتوں کے ذوق سے متاثر تھے۔ اگر اس کی قمیص کا ایک بٹن بھی ٹوٹ جاتا تو وہ قمیص ہی بدل ڈالتا تھا۔ اور یہ پیلے رنگ کا چیتھڑا کسی بھی کام کا نہیں ہو سکتا، اس نے سوچا۔ اس نے من جری کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

"اے سنو، میں یہ چیتھڑا لے رہا ہوں اور اس کے بدلے یہ دس روپیہ رکھ لو" اس نے شال کو اپنے ہاتھ میں اٹھاتے اور دس روپیہ کا نوٹ شال کی جگہ رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں؛ من جری زور سے چلائی، کیوں کہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی شال لے جائی جا رہی تھی۔

اچھا ٹھیک ہے، یہ پچاس روپیہ لو، اس سے تم ایک اچھی شال لے سکتی ہو، رنجیت نے من جری کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے خواب وخیال میں بھی نہ تھا کہ کسی کے لیے اس چیتھڑے کی بھی اہمیت ہو سکتی ہے جو پہلے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ اُس نے پچاس کا نوٹ ایک پتھر کے نیچے رکھ دیا اور من جری کی طرف دیکھے بغیر تیزی سے پلٹ پڑا۔ وہ شال کو پٹیوں کی طرح پھاڑتا جا رہا تھا۔

من جری پانی سے باہر آ گئی اور کنارے پر کھڑی اپنی شال کو پھٹتے ہوئے دیکھتی رہی۔ ڈوبتے سورج کی چمک نے اس کی آنکھوں کو پُرنم کر دیا، اُس نے مایوسی کے عالم میں اپنے بازو پھیلا دیے۔

اس کے لیے روپیہ کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ تھکے قدموں سے وہ پیچھے مُڑی اور روتے بلکتے وہ گاؤں کی طرف چل دی۔

"انھوں نے میری شال لے لی"۔ وہ روتی ہوئی ہر ایک سے کہہ رہی تھی۔ من جری کو ٹھنڈ لگ رہی ہے، رام پر ساد کو

ٹھنڈ لگ رہی ہے"۔ وہ بار بار یہی رَٹ لگا رہی تھی۔ کسی نے اُس کے کندھوں پر ایک اور پرانی شال ڈال دی۔ لیکن اُس نے شال نہیں لی، اُس نے ایک ہی رَٹ لگا رکھی تھی۔ "یہ میری شال نہیں ہے"۔

اُس رات وہ چائے کے ہوٹل کی ٹِن کی چھت کے نیچے سردی سے کانپتی اور چلاتی رہی۔ وہ اس وقت دوپہر میں بھی وہاں موجود تھی، جب گیارہ سالہ بھولو اسکول سے واپس آیا۔

بھولو کو اس واقعہ کے بارے میں پہلے ہی پتہ لگ چکا تھا۔ وہ دور سے کھڑا من جری کو دیکھتا رہا۔ من جری نے اب تک کھانے پانی کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ وہ بار بار ایک ہی بات دوہرائے جا رہی تھی۔

بھولو نے اُن مردوں اور عورتوں کی باتیں سُنیں جو من جری کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

جب وہ سولہ سال کی تھی، من جری کے ماں باپ مر گئے۔ وہ ایک ہنستی مسکراتی بچی تھی لیکن اچانک سب سے الگ تھلگ گوشہ نشیں ہو گئی تھی۔ صرف اُس کا پالتو کتا رام پرساد تھا۔ جس کو دیکھ کر وہ خوش ہو جایا کرتی تھی۔ چھ ماہ کے اندر اندر رام پرساد بھی مر گیا۔ من جری صدمے سے نڈھال ہو گئی اور پھر شدید بیمار پڑ گئی۔ گاؤں کی عورتوں نے اُس کی دیکھ بھال کی لیکن جب وہ بیماری سے صحت یاب ہوئی تو آج کی نیم دیوانی من جری ہو چکی تھی۔ شال جو وہ ہر وقت اپنے اِرد گرد لپیٹے رہا کرتی تھی۔ دراصل اس کی ماں کی نشانی تھی۔ من جری نے کبھی بھی اس شال کو اپنے تن سے جُدا نہ کیا تھا۔ شال کا کھو جانا اُس کے لیے بہت تکلیف کی بات تھی، اس لیے وہ کچھ بھی کھانے سے انکار کر رہی تھی۔

بھولو جو یہ سن کر پریشان ہو گیا تھا، بے خیالی میں ایک کنکر کو لات ماری۔ اُسے اپنے اوپر غصہ تھا۔ وہ شرمندہ تھا۔ وہ اُنھیں لڑکوں میں سے ایک تھا جنھوں نے ایک روز پہلے ہی من جری کو بے حد ستایا تھا۔

او خدایا، وہ راستے میں پڑے ایک اور کنکر کو لات مارتے ہوئے بڑبڑایا۔ اتفاق سے یہ پتھر کا ٹکڑا اُچھل کر پاس لیٹے ہوئے ایک کتے کے بچے کو لگ گیا۔ اور اُس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔

کتے کے بچے کی آواز بہت تیز اور وحشت ناک ہوتی ہے۔ بھولو نے بھونکتے ہوئے بچے کو فوراً اٹھا لیا اور اُسے خاموش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ پِلّا ابھی بھی چلائے جا رہا تھا کہ اچانک اُس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

پِلّے کو گود میں اُٹھا کر وہ من جری کی طرف دوڑا۔ "من جری، من جری" وہ ہانپتے ہوئے چلایا۔ "تمہارا رام پرساد مل گیا۔ یہ رو رہا ہے۔ اس کو پکڑو، اور یہ کہتے ہوئے اُس نے پِلّے کو من جری کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ خود بخود من جری نے پِلّے کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

چند لمحوں کے لیے من جری، حیران و پریشان ہو گئی، پھر بولی، "ارے تمہیں تو چوٹ لگی ہے۔ میرا رام پر سادز خمی ہے "اُس نے اپنے گالوں سے لگا کر اُسے بھینچ لیا۔

وہ اُسے بے حد پیار کرنے لگی۔ اُس کے ہاتھوں کی نرم گرمی نے اثر دکھایا اور چیّ خاموش ہو گیا۔ اُس نے من جری کے منہ کو چاٹنا شروع کر دیا۔ "تم اتنے دنوں سے کہاں کھو گئے تھے؟" من جری بولے جا رہی تھی۔ "تم کتنے کمزور ہو۔ تم نے کچھ نہیں کھایا۔ آؤ، اب میں تمہیں کھانا دوں گی"۔

وہ چائے والے کی دوکان پر گئی اور اُس نے وہ چپاتی اٹھالی۔ جس کو وہ پہلے منع کر چکی تھی۔ اُس نے ایک چائے کا پیالہ بھی لے لیا۔ اُس چپاتی کے لقموں کو چائے میں ڈبویا اور چیّ کو کھلانے لگی۔ اسی دوران وہ تھوڑا بہت خود بھی کھا لیتی تھی۔ پھر اُس نے وہ شال بھی اُٹھالی جو اُس نے پہلے دور پھینک دی تھی۔ اُس نے اپنے اور چیّ کے چاروں طرف لپیٹ لی۔ سب لوگ دم بخود خاموشی سے من جری کو دیکھ رہے تھے۔ جب وہ کوئی اور چیز مانگنے آئی تو گاؤں والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

ایک بار پھر من جری کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی تھی۔

بھولو جو ذرا دُور کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اپنے دل میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ سورج چند پنساری خاموشی سے اُس کی طرف آیا اور اُس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ بھولو نے پیچھے مڑ کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیے۔
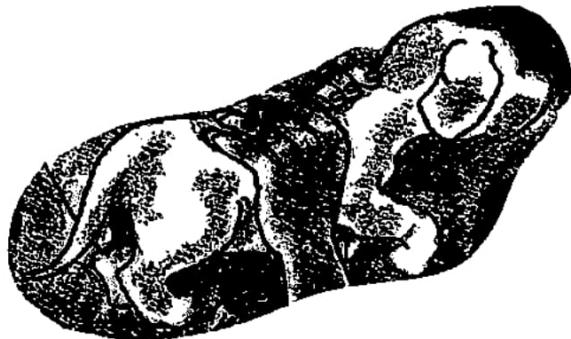
بھولو

ونیتاوید

لیفٹیننٹ شمشیر پرتاپ سنگھ نے جیسے ہی محسوس کیا کہ کوئی جانور آہستہ آہستہ جھاڑیوں کے پیچھے چل رہا ہے، اس کا خون جم سا گیا۔ اس کا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا وہ ایک تربیت یافتہ سپاہی تھا۔ جنگ کے لیے ہمیشہ تیار۔ لیکن یہاں اس کا دشمن مختلف تھا۔ سب سے زیادہ خراب چیز جو اس کے دماغ میں ایک دم آئی وہ یہ تھی کہ کیوں نہ یہاں سے بھاگ جائے۔ نہیں۔ اسے حملے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

اب ٹائیگر بالکل سامنے آچکا تھا۔ بالکل خاموش، حملہ کرنے کے لیے آمادہ۔ شمشیر کے خواب و خیال میں نہ تھا کہ اس کی ملاقات آدم خور چیتے سے ہو جائے گی جس کے شکار کے لیے وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں آیا تھا۔

خیمہ میں کرسی پر آرام کرنا، انگیٹھیوں کا جلنا اور چاروں طرف دور دور تک جنگل، شمشیر کو اچھا لگتا تھا۔ کئی کئی دنوں تک وہ جنگل میں مناسب جگہ کی تلاش میں اور خیمہ لگانے کے لیے وہ گھومتے گھومتے تھک گئے تھے۔ آج مکمل سکون اور آرام کی خاطر اس نے اپنے ساتھیوں کو پاس کے دریا پر نہانے کے لیے بھیج دیا۔ شمشیر تنہا اپنی خالی رائفل کی صفائی میں جٹ گیا، ساتھ ساتھ وہ اگلے دن چیتے کو شکار کرنے کے لیے بھی سوچ رہا تھا۔ شاید یہ قسمت کا ہی کھیل تھا

کہ بن بلایا مہمان اسی وقت اس سے ملنے آ گیا تھا۔

چیتے کو اپنے بالکل سامنے دیکھنے سے پہلے ہی شمشیر نے اس کی آہٹ سن لی تھی۔ ایک ہی لمحے میں، شمشیر نے اپنی رائفل اٹھائی اور درندے کی طرف لپکا۔ چیتا قطعی خوفزدہ نہ تھا۔ بلکہ اس نے شمشیر کو زمین پر پٹخ دیا۔ اور اس کی بندوق اس سے دور جا گری۔ شمشیر پوری طاقت سے چیتے کو پیچھے دھکیلنے لگا۔ ایک نامعلوم خوف اور غصے سے ہانپتے ہوئے شمشیر نے اپنے اندر عجیب طرح کی طاقت کو محسوس کیا۔ جس سے وہ خود ناواقف تھا۔

اپنی خوراک کھانے سے پہلے چنگھاڑتے ہوئے چیتے نے اپنے بڑے سر کو نیچے کیا اور اپنا بڑا بھیانک جبڑا کھول دیا۔ اس کے دانت شمشیر کی کھوپڑی کو نشانہ بنائے ہوئے تھے شمشیر اب ایک ہی کام کر سکتا تھا۔ جو اس نے فوراً کر ڈالا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی مٹھی چیتے کے گلے میں پوری طاقت سے دور تک گھسیڑ دی اور دوسرے ہاتھ سے چیتے کی لپ لپاتی زبان کو زور سے کھینچا۔ اس سے پہلے کہ چیتا اس کے ہاتھ کو چبا ڈالتا شمشیر نے اپنے آپ کو اس درندے سے چھڑا لیا۔ ایک فوق الانسانی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شمشیر جانور کے اگلے پیروں سے لپٹ گیا اور اس ساتھ ہی اس نے اپنی ٹانگوں کو چیتے کے پیٹ کے اردگرد جکڑ لیا۔ وہ دونوں دور تک گھسٹتے چلے گئے۔

شمشیر کے لیے یہ ایک ہاری ہوئی بازی تھی۔ وہ کمزور پڑ رہا تھا اس کی پکڑ کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

اسی وقت وہاں کچھ ہل چل سی محسوس ہوئی۔ چیتے کو کسی نے اس سے دور پھینک دیا تھا۔

شمشیر بری طرح تھک چکا تھا۔ وہ زمین پر بے حال پڑا تھا، تبھی اس نے محسوس کیا کہ وہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ بمشکل اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ شاید ایک بھالو تھا جو چیتے سے گتھم گتھا ہو گیا تھا۔ ایسا کیسے ممکن ہے شمشیر نے سوچا اور اس کے بعد اس کا ذہن اندھیروں میں کھو گیا وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

مول سنگھ، شمشیر کا خدمت گار لالٹین کو جلاتے ہوئے اور خیمہ کے اندر ایک کیل پر ٹانگتے ہوئے بڑبڑایا۔

"میں کیوں نہانے چلا گیا تھا؟ مجھے صاحب کی بات نہیں ماننی چاہیے تھی"۔ اور اپنے آپ سے بولا۔

"حکم نہ ماننے پر مجھے سزا ہی تو ملتی، اور کیا ہوتا"۔

مول سنگھ، تیزی سے چارپائی کی طرف مڑا، خدا کا شکر ہے، صاحب جی آپ زندہ ہیں۔ ہمیں تو آپ کے بچنے کی کوئی امید ہی نہ تھی"۔ مول سنگھ اپنے آنسو چھپانے کے لیے دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"میں واقعی مر جاتا"۔ شمشیر نے سوچا۔ اگر وہاں وہ بھالو نہ آجاتا جس نے میری جان بچائی۔ شاید وہ خوابوں کی باتیں کر رہا تھا۔ شاید وہ مول سنگھ ہی ہو گا جس نے میری جان بچائی تھی۔

"میری زندگی بچانے کا شکریہ۔" "تم نے کس طرح چیتے کو مجھ سے دور پھینک دیا تھا؟"

"جی ہاں! چیتا مر چکا ہے"۔ مول سنگھ نے شمشیر کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اب زیادہ بات نہیں، صاحب جی۔ میں اب آپ کے زخموں پر یہ پٹی لگاؤں گا اور دودھ میں ہلدی ڈال کر بھی دوں گا"۔

شمشیر کا دماغ جواب سننے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ لیکن مول سنگھ کے احکامات کو نظر انداز کرنا بھی دشوار تھا۔ اس نے اپنے دماغ کو بند کر لیا اور آرام کرنے لگا۔

اگلی شام، شمشیر خیمہ سے باہر نکلا اور آگ کے سامنے جا کر بیٹھ گیا جو مول سنگھ نے اس کے لیے سلگائی تھی۔ مول سنگھ نے دوسرے لوگوں کو کچھ ہدایات دیں اور پھر زمین پر بیٹھ کر اپنے صاحب جی کے پیروں کو مالش کرنے لگا۔

آرمی کمیشن میں چلے جانے کے بعد شمشیر جب پہلی مرتبہ گھر واپس آیا تو اس کی پوری حویلی میں ایک آدم خور کی کہانی کی گونج تھی، جس نے کے جنگل میں تمام لکڑہاروں کو بری طرح خوف زدہ کر رکھا تھا۔ کیوں کہ شمشیر کے چاچا جی، بڑے سرکار کہیں شکار کھیلنے گئے ہوئے تھے، سب نے چھوٹے سرکار یعنی شمشیر سے ہی امید کی کہ وہ کچھ کرے گا۔

اپنے باپ کی طرح، جو کہ ایک نامی گرامی شکاری اور علاقے کے بڑے زمیندار تھے شمشیر کو بھی جنگل سے ایک خاص لگاؤ تھا کیوں کہ وہ اسی ماحول میں بڑا ہوا تھا اور یہ مصر کہ اس کی دیرینہ تمنا کو پورا کر سکے گا جو اس کے اعصاب پر بری طرح سوار تھی۔ خاص طور پر جب سے اس کے چاچا جی نے اسے شکار پر جانے کی اجازت دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ بھی اس وقت جب اس کی تعلیم اور کمیشن مکمل ہو جائے گا۔

اس طرح اس نے اپنے چاچا جی کے کچھ آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا اور کچھ قبائلیوں کو اپنا گائیڈ مقرر کیا۔

اپنے خادم کے جھکے ہوئے سر کی طرف دیکھتے ہوئے شمشیر نے ایک سوال دوہرایا۔ "مول سنگھ جی، آپ کس طرح اس درندے کو مجھ سے الگ کرنے اور مارنے میں کامیاب ہوئے تھے"۔

"کیا، چیتے کو مارا، صاحب جی، وہ تو مرا پڑا تھا۔ کیا میں نے اس کو مارا؟"

نہیں، صاحب جی۔ ہمیں تو خود تعجب ہے کہ کیوں کہ ہم نے آپ کو زخمی حالت میں سوکھے پتوں پر پڑا پایا تھا۔ سب

سے زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ آپ کے تمام زخم بالکل صاف تھے، جیسے کہ کسی نے ان کو چاٹا ہو۔ ہم نے سوچا، شاید بھالو نے حملہ کیا ہو، کیوں کہ وہاں ہر جگہ بھالو کے پیروں کے نشانات موجود تھے۔ شمشیر کو اچانک سیدھا بیٹھتے دیکھ کر اس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

کیا؟ بھالو، کیا کہا تم نے بھالو یعنی ریچھ؟ شمشیر نے سوال کیا۔ اس نے مول سنگھ کے کندھوں کو زور سے پکڑتے ہوئے ہلکے سے کہا، بھولو، اس نے میری جان بچائی۔ بھولو میری مدد کو آیا تھا"۔

یہ نام شمشیر کے سر میں کچوکے لینے لگا۔ اس کے ذہن میں دفن وہ یادیں جن میں تکلیف تھی، افسوس تھا، اور غم تھا جن کو وہ تقریباً بھول چکا تھا، ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں۔ اس کو سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ "اوہ خدایا" اس نے سر کو جھٹکا دیا۔

"کیا ہوا صاحب جی"؟ بھولو کون ہے"۔ مول سنگھ نے پوچھا۔

اس کا گلا خشک ہو گیا تھا، اس نے اپنی تمام یادوں کو زبان پر لانے کا فیصلہ کیا شمشیر نے خلا میں گھورتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ بہت پرانی بات ہے شمشیر ایک بار پھر اپنے بچپن کی طرف لوٹ گیا۔

حویلی میں ایک بار پھر چہل پہل لوٹ آئی تھی۔ بڑے سرکار کئی مہینوں بعد جنگل سے شکار کے بعد لوٹے تھے۔

بارہ سالہ شمشیر خود پر بمشکل قابو رکھ سکا جب اس کے چاچا جی نے اسے اپنے پاس بلایا۔ اس سے بھی زیادہ اسے اس وقت مزہ آیا جب اس کی آیا اس کو بیٹھک کی بجائے حویلی کے پچھلے حصے کی طرف لے گئی۔

"آؤ، شمشیر پرتاپ جی، دیکھو ہم تمہارے لیے کیا لائے ہیں"۔

لوگوں کے ہجوم کے بیچ شمشیر نے ایک سہمے ہوئے چھوٹے سے ریچھ کے بچے کو دیکھا۔

اُس نے اپنے چاچا جی کی طرف دیکھا۔

یہ تمہارے لیے ہے۔ یہ ہمیں اپنی مری ہوئی ماں کے پاس پڑا ملا۔ اب یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ تم اب اس کی اپنے چھوٹے بھائی کی طرح دیکھ بھال کرو۔

نوکروں کی بھیڑ میں ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، انھوں نے آواز دی، "جے سنگھ جی" اس ریچھ کے بچے کی دیکھ بھال میں تم چھوٹے سرکار کی مدد کرو گے"۔

اور اس طرح یہ دوستی شروع ہوئی۔ شمشیر کا زیادہ تر فالتو وقت بھولو کے ساتھ گذرتا۔ یہ نام جے سنگھ نے ریچھ کے بچے کا رکھ دیا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں بھولو ایک دیو ہیکل جانور بن گیا تھا، اُس کی خوراک بھی اُس کی طرح بہت بڑی تھی۔ اُن کا زیادہ تر وقت نیم خشک دریا کے کنارے گذرتا، جے سنگھ ہمیشہ اُن کے ساتھ ہوتا۔

وقت گذرتا گیا۔ بھولو بے چین سا رہنے لگا۔ کبھی اُسے زنجیر سے نہیں باندھا گیا تھا وہ پورے صحن میں آزادانہ گھوما کرتا۔ لیکن عمر کے ساتھ ساتھ اس کی فطرت قید و بند سے آزاد ہونے کے لیے بے چین تھی، وہ، وہ سب قدرتی مزے لینا چاہتا تھا جو قدرت نے اُس کے لیے متعین کیے تھے۔ وہ اندھیرے جنگل کی طرف جو کہ حویلی کے چاروں طرف تھا گھنٹوں دیکھا رہتا۔

کچھ ہی دنوں بعد، بھولو حویلی کے جنگلے کو توڑ کر باہر کی طرف بھاگنے لگا۔ شروع میں اُس کی ان اداؤں پر ہنسی آتی تھی۔ وہ بآسانی پکڑ لیا جاتا اور واپس لے آیا جاتا۔ پھر وہ ہر ایک کو اپنے نوکیلے پنجوں سے ڈرانے لگا، سوائے شمشیر کے۔ حد تو یہ کہ وہ جے سنگھ کو بھی ڈرانے سے باز نہیں آتا تھا۔

شمشیر نے کسی نہ کسی طرح بھولو کو سزا ملنے سے بچائے رکھا۔ لیکن چھوٹے سرکار کے پاس شکایات برابر آتی رہیں۔

شمشیر کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اچانک جے سنگھ نے ایک روز کہا۔

"چھوٹے سرکار! آپ کو بڑے سرکار نے یاد کیا ہے"۔

جے سنگھ کے اس ناگہانی اعلان سے سہما ہوا شمشیر، جے سنگھ کے ساتھ اپنے چچا جی کے سامنے گیا۔

مسٹر ہیتھ(Heath) جو کہ برٹش ریزیڈنٹ کے نمائندہ تھے۔ ان کو اپنے چچا جی کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر وہ سہم گیا۔

مسٹر ہیتھ(Heath) تمہارے ریچھ کے بارے میں شکایت کر رہے ہیں۔ تمہارے ریچھ نے آس پاس کے تمام لوگوں میں خوف پھیلا رکھا ہے۔

"تمہارے" لفظ پر خاص طور پر زور دیا گیا تھا شمشیر نے اپنی آنکھیں احساسِ جرم سے جھکا لیں۔

اس کے چچا جی نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا آج صبح اس نے ان کا جنگلا توڑ دیا اور اندر جا کر ان کے پالتو کتے کو جان سے مار ڈالا"۔

بعد کے جملوں سے شمشیر کا سانس رکنے لگا۔ "نہیں، اب مزید برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ میرے پاس اس مسئلہ کو حل کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کو گولی مار دوں اور دوسرا یہ کہ اس کو دریا کے اس پار پہاڑوں کی طرف جنگل میں چھوڑ دیا جائے۔ تمہاری کیا رائے ہے"۔

شمشیر خاموش کھڑا رہا۔ اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ مسٹر ہیت(Heath) آگے کی طرف جھک رہے تھے۔

"ہاں بولو، کیا کریں"۔ اس کے پتاجی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکتے ہوئے، بغیر کسی بحث مباحثہ کے، کیوں کہ ایسا کرنا اس کے شاہی نشو و نما کے خلاف تھا۔ شمشیر صرف اتنا کہہ پایا۔ "اس کو جنگل میں چھوڑ دیا جائے"۔

کمرے سے باہر نکل کر شمشیر پاگلوں کی طرح بھاگتا ہوا بھولو کے پاس پہنچا ریچھ کو پیار کرتے ہوئے، شمشیر، بھولو سے لگ کر خوب رویا۔ بھولو اپنے دوست کے غم سے نڈھال ہو گیا تھا۔ شمشیر کو خوش کرنے کے لیے وہ تمام ترکیبیں کرنے لگا۔

شمشیر زبردستی مسکرایا۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اس غم کو کبھی اپنے دل سے نہ نکال سکے گا۔

صبح چار بجے وہ لوگ بھولو کو لینے آگئے۔ لیکن تمام تر کوششیں اس کو لے جانے کی ناکام ہو گئیں۔ آخر تنگ آکر جے سنگھ نے شمشیر کو جگایا جو اپنے تمام آنسو خرچ کر دینے کے بعد سو گیا تھا۔

اپنے دوست کو دیکھ کر بھولو خوش ہو گیا۔ اس نے شمشیر کی طرف دیکھا کہ آج اس کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ ہو رہا تھا۔

اپنے دوست کے پاس جاکر شمشیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ "نہیں، نہیں" آپ لوگ جائیں۔ میرے بھولو کو کوئی مجھ سے دور نہیں لے جا سکتا"۔

وہ بہت رویا اور گڑگڑایا، لیکن جب جے سنگھ نے اسے ٹوکا۔ "چھوٹے سرکار آپ بڑے سرکار کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے"۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے آنسو تیزی سے بہنے لگے۔ شمشیر نے روتے ہوئے اپنا منہ بھولو کے سینے میں چھپا لیا اور پھر مڑے بغیر اس نے ریچھ کو گلوبند سے پکڑ لیا۔

بھولو بہت زور سے مچلا اور شمشیر کی طرف گھسٹنے لگا۔ گلوبند اس کے گلے میں پھنس رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکا وہ شمشیر کی طرف کھنچا چلا گیا۔

شمشیر مڑا اور پیچھے کی طرف جانے لگا۔

تب بھولو نے اچانک اپنی جدو جہد بند کر دی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے شمشیر کی طرف اداس نظروں سے دیکھا۔ اپنے دوست کو آخری بار دیکھتے ہوئے بھولو نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا جو اس کو لے جا رہے تھے۔

اس کے بعد سے ہم نے اس کو کبھی نہیں دیکھا مجھے آج بھی اس کو اس کے نام سے پکارنا یاد ہے۔ جو ایک پرانی بات ہے۔ لفٹننٹ شمشیر پرتاپ سنگھ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھولو کا وہ چہرہ آج بھی یاد ہے"۔

شمشیر شاید مول سنگھ سے نہیں اپنے آپ سے بات کر رہا تھا۔ میں فطری طور پر جو کہ بچے میں قدرتی ہوتی ہے یہ سمجھ چکا تھا جیسے کہ وہ مجھ سے کہہ رہا ہو کہ وہ مجھے ہر گز بھی کسی کو لے جانے نہیں دے گا۔

میں رات اور دن اکثر یہی سوچتا تھا کہ میں ایک بے اعتبار قسم کا دوست تھا۔ میرا عمل ان تمام قدروں کے برعکس تھا جو میرے اندر بھری گئی تھیں۔ مجھ میں آخر اتنی ہمت کیوں نہ تھی کہ میں اپنے چاچا جی سے احتجاج کر سکوں؟ ایک جانور کے لیے اتنے آنسو کیوں، شاید مجھ سے یہی کہا جاتا۔ نہیں بھولو ایک جانور نہیں تھا وہ میرا دوست تھا، جس کو مجھ پر اعتماد تھا لیکن میں نے اسے دھوکا دیا تھا۔

مول سنگھ اپنے چھوٹے سرکار کو غم اور مایوسی کے عالم میں گھرا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے اندر ایک طرح کا آئیڈیالزم (آدرش واد) تھا۔ لیکن ابھی اسے زندگی میں بہت کچھ دیکھنا باقی تھا۔ لیکن زندگی کا سبق ہمیشہ مہربان نہیں ہوتا۔

آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور چاند پوری طرح نکل آیا تھا۔ اب کہنے کو کچھ اور باقی نہ تھا۔ شمشیر اٹھ کر خیمہ کے اندر چلا گیا۔

اگلے روز خیمہ میں ایک عجیب طرح کی ویرانی سی تھی۔ آدم خور پہچانا جا چکا تھا وہ مر چکا تھا۔ ان کا کام پورا ہو چکا تھا۔ واپس جانے کی تیاری کی جانے لگی۔

"ایک لمحے میں آیا"۔ شمشیر نے مول سنگھ سے کہا جو کہ بتانے آیا تھا کہ واپس جانے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔

شمشیر نے آخری بار سب طرف دیکھا۔ پھر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کہاں سے گھنا جنگل شروع ہو رہا تھا، جو کہ خیمہ سے تھوڑی ہی دور سے شروع تھا۔ جھاڑیوں کے پار نظر دوڑاتے ہوئے شمشیر نے ہلکے سے کہا "بھولو" مجھے

معاف کر دینا۔ شمشیر واپسی کے لیے مڑا۔

جھاڑیوں میں کچھ آہٹ سی ہوئی۔ وہ چوکنا ہو گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ بالکل آہستہ آہستہ ایک ریچھ جھاڑیوں کے پیچھے سے نمودار ہوا۔

شمشیر اور ریچھ نے ایک دوسرے کو دیکھا وہ دونوں جم سے گئے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کے قریب آنے کی کوشش نہیں کی۔

"صاحب جی، صاحب جی، مول سنگھ کی پریشان کن آواز سے خاموشی ٹوٹی۔ ریچھ میں حرکت ہوئی، تھوڑا پیچھے ہٹا اور پھر جنگل میں غائب ہو گیا۔

"بھولو نے مجھے معاف کر دیا"۔ خوشی کی لہر شمشیر کے دماغ میں دوڑ گئی اس نے یہ احساس کیا! اور اسے ایک اور خیال بھی آیا کہ بھولو جہاں ہے وہاں خوش ہے اصل میں بھولو اسی جگہ کا ہے۔ انھیں جنگلوں کا۔ جہاں اسے قدرتی آزادی میسر ہے۔

"الوداع، دوست، اب چلنے کا وقت آ گیا ہے"۔

شمشیر نے ہلکے سے کہا۔

اور پھر وہ اپنے ساتھیوں میں جا کر مل گیا جو اس کے منتظر تھے۔ آج اس کے دماغ سے گناہ کا احساس ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکا تھا۔
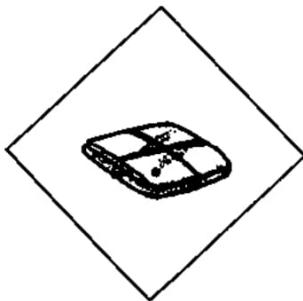
سپاہی کا بیٹا

شوبھا گھوس

ہوائی جہاز آسمان میں کانپتا تھر تھراتا اپنا رخ بدل رہا تھا۔ جہاز ایک پرندے کی طرح اپنا توازن قائم کرنے کی جد وجہد کر رہا تھا اور اڑان کو جاری رکھنے کی کوشش میں تھا۔ بہت تیزی سے وہ اپنی بلندی کھو رہا تھا اور زمین کی طرف آرہا تھا۔ شاید چند ہی منٹوں میں وہ گرنے والا تھا۔ اچانک اس میں سے ایک پیکر نکلا جو زمین پر آرہا تھا ایک سفید چیز آسمان میں پھول کی طرح کھل گئی اور وہ پیکر آہستہ آہستہ ہوا کے دوش پر زمین پر آ لگا۔

تھوڑے ہی فاصلے پر پیڑوں کے جھنڈ سے ایک چھوٹا سا بچہ نکلا۔ وہ کچھ دیر سے جہاز کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔ اس نے جہاز کو دشمن کا نشانہ بنتے دیکھا تھا اور تبھی جلتے ہوئے جہاز سے پائلٹ پیراشوٹ کے ذریعہ کود گیا تھا۔ وہ پیڑوں کے سائے سے باہر نکلا۔ دوسرے ہی لمحے اچانک اس کے سامنے ایک دس بارہ سال کا بچہ کھڑا تھا جو زخمی پائلٹ کے نزدیک آ چکا تھا۔

"سر آپ میرے ساتھ آیئے۔ دشمن یہاں کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ ہم وقت ضائع نہیں کر سکتے۔ یہاں قریب ہی ایک فوجی کیمپ ہے وہاں آپ محفوظ رہیں گے"۔

پائلٹ بمشکل اپنے پیروں پر کھڑا ہو پایا، وہ دو قدم ہی چل پایا تھا کہ زمین پر گر گیا۔ "میں چل نہیں سکتا۔ شاید میرے پیروں کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گے؟"

بچے کو محسوس ہوا کہ وہ بے حد مشکل سے بول پارہا تھا"یس سر۔ آپ جو بھی کہیں گے میں کروں گا۔ تم چھوٹے بچے ہو وہ بڑبڑایا۔ چلو دیکھ لیتے ہیں"۔

نہیں صاحب، آپ یقین کریں، میں وہی کروں گا جو آپ چاہیں گے۔

اس آدمی کے ہاتھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی جیب میں کچھ تلاش کیا اور کاغذوں کا ایک بنڈل باہر نکالا۔ تم ان کاغذوں کو آرمی یونٹ کے کمانڈنگ افسر کے پاس لے جاؤ۔ اس نے کہا۔ 'ان سے کہنا۔ ان کاغذوں کو بہت حفاظت سے آج رات تک انبالہ اسٹیشن پہچانا ہے۔ اب تم اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہوئے اور اپنے ملک کی خاطر دوڑ جاؤ۔ دشمن سے اپنے آپ کو بچانا۔ کیا تم یہ سب کر سکو گے"۔

"بالکل جناب، میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن آپ؟ دشمن آپ کو پکڑ لے گا"۔

میری پرواہ نہ کرو۔ میں فرار نہیں ہو سکتا۔ میں انھیں یہاں روکنے کی کوشش کروں گا۔ تم فوراً چلے جاؤ اور یہ پیکٹ پہنچادو۔

"یس سر"، بچے نے سیلوٹ کرتے ہوئے کہا۔

وہ آدمی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ جب کہ وہ درد اور زخموں سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ بچے کے پاس سے مخالف سمت میں رینگنے لگا۔

چھوٹا بچہ کھلے آسمان سے پیڑوں میں گم ہو گیا جہاں سے وہ نمودار ہوا تھا۔ دشمن نے اس کو دیکھ لیا تھا کچھ نے اس کا پیچھا کیا اور اس پر گولی چلادی۔ اس کے پاس ادھر ادھر گولیاں لگیں۔ بچہ تیزی سے دوڑا اور نظروں سے غائب ہو گیا۔ دشمن نے بچے کا پیچھا چھوڑ کر رینگتے ہوئے پائلٹ کی طرف دھیان دیا۔

چند منٹ بعد، ایک چھوٹا بچہ آرمی یونٹ کی سنتری چوکی کے سامنے کھڑا تھا۔ مجھے کمانڈر صاحب کے پاس پہنچادیں۔ مجھے کچھ چیز ان تک پہنچانی ہے"۔

"بچے تم کمانڈر صاحب کے پاس نہیں جاسکتے۔ کسی کو بھی ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں ہے جب تک کہ کوئی اہم کام نہ ہو"۔

"میرے پاس جو ہے وہ بہت اہم ہے۔ یہ اس پائلٹ نے دیا ہے جس کے جہاز کو گرادیا گیا ہے"۔

تمہارا مطلب، وہی جہاز جو ابھی گرا ہے۔ ایک مددگار دستہ اس کی مدد کے لیے جاچکا ہے۔

"جی ہاں! میں اس کی مدد کو جا پہنچا تھا دشمن اس کے پیچھے لگے تھے وہ زخمی حالت میں تھا اور چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے مجھے ایک پیکٹ دیا جو فوراً کمانڈر صاحب کے پاس پہنچانا ہے"۔

سنتری نے بچے کی تلاشی لی۔ اس نے بخوشی تلاشی دی لیکن خون سے لت پت پیکٹ کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

"میں آپ سے پھر کہتا ہوں"۔ یہ کام فوراً کرنا ہے۔ پائلٹ بری طرح زخمی ہے اور وہ چلنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ دشمن اس کو پکڑ لے گا اور اس پر ظلم توڑے گا۔ مجھے فوراً کمانڈر صاحب سے ملا دیں۔ مجھے یہ پیکٹ ان کے حوالے کرنا ہے۔ میں افسر کو بتاؤں گا کہ دشمن کس جگہ پر جمع ہے"۔

"ٹھیک ہے۔"

سنتری نے فون پر کچھ بات کی۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک سپاہی سنتری پوسٹ پر آ پہنچا۔ "میرے ساتھ آؤ اس (Nissen Hut) تک۔"

وہ اندر داخل ہوا۔ ساتھ میں بچہ، سپاہی نے رسمی سیلوٹ مارا بچے نے بھی ایسا ہی کیا۔ سب نے بچے کی طرف غور سے دیکھا۔

"آؤ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟" کمانڈنگ افسر نے معلوم کیا

جو جہاز تھوڑی دیر پہلے گرا تھا اس کے پائلٹ نے مجھے یہ پیکٹ آپ تک پہنچانے کے لیے دیا ہے۔ سر اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ پیکٹ آج رات تک ہر حال میں انبالہ ائیر فورس اسٹیشن پہنچ جانا چاہیے۔"

"اچھا! لیکن تم کون ہو"۔

میرا نام مقبول بٹ ہے۔ میرے والد کو بہادری کے لیے تمغہ ملا تھا۔ وہ قوم کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ میں اور امی اب یہیں رہتے ہیں میں جہاز کو اترتا ہوا دیکھ رہا تھا تبھی میں نے انٹی ائیر کرافٹ فائیر کی آواز سنی میں نے دیکھا جہاز لڑکھڑا رہا تھا۔ میرے سامنے ہی جہاز زمین پر گرا۔ میں اس کی مدد کے لیے وہاں جا پہنچا۔ دشمن وہاں سے تھوڑی ہی دور تھا میں اس کو ایک چھوٹے راستے سے لانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے دیکھا وہ چلنے کے قابل نہیں تھا اس کے جسم سے بری طرح خون بہہ رہا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس کی پرواہ نہ کروں۔ بلکہ اس پیکٹ کو کسی طرح آپ تک پہنچا دوں اور آپ سے کہوں کہ یہ آج رات تک ہر حالت میں انبالہ پہنچا دیا جائے یہ بہت اہم ہے"۔

"بیٹا! تم بہت بہادر بچے ہو"۔ کیا تمہیں دشمن سے ڈر نہیں لگا؟"

میرے والد نے مجھے بتایا تھا کہ دشمن سے ہرگز نہ ڈروں وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا جب تک کہ گولی پر تمہارا نمبر ہی نہ آ گیا ہو"۔

کمانڈنگ افسر بچے کی بات سن کر مسکرایا۔ "کیا دشمن نے پائلٹ کو پکڑ لیا"۔

"مجھے نہیں معلوم سر۔ میں یہ سب دیکھنے کے لیے وہاں نہ رک سکا۔ مجھے پہلے اس کام کو کرنا تھا مجھے معلوم ہے وہ کس جگہ پڑا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ دشمن کس جگہ جمع ہوا ہے میں ایک چھوٹے راستے سے آپ کو وہاں لے جا سکتا

ہوں۔ آپ ان کا پیچھا کر سکتے ہیں اور ان کی واپسی کے تمام راستے بند"۔

تم واقعی ایک بہادر سپاہی کے بہادر بیٹے ہو۔

ہمیں فوراً چلنا چاہیے۔ دشمن یہاں تک پیدل آیا ہے۔ اگر آپ اپنی جیپ لے چلیں تو آپ ان کا گھیرا ڈال سکتے ہیں اور بآسانی پکڑ سکتے ہیں"۔

"آپ کی ہدایات نوٹ کر لی گئی ہیں۔ سر، فوراً عمل کیا جائے گا"۔ کمانڈنگ افسر مسکرایا۔

چند ہی منٹ بعد دشمن کے سپاہیوں نے اپنے آپ کو جیپوں سے گھرا ہو ا پایا۔ فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ ان میں سے ایک نے دوڑنے کی کوشش کی لیکن بہت جلد اس نے محسوس کر لیا کہ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اپنی بندوق پھینکتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ اپنے سر کے اوپر اٹھا دیے۔

دشمن کو پکڑ لیا گیا تھا اور پائلٹ کی جان بچ گئی تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ رہا تھا کیوں کہ اس کو دور تک کھینچا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ اٹھ کے چلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کو سنگین سے گودا گیا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں بڑبڑا رہا تھا۔ بچہ...... پیکٹ...... کے علاوہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"اس کو فوراً ملٹری اسپتال لے جاؤ۔ آرام آرام سے، ایسا نہ ہو اس کو جھٹکے لگیں۔ اور میجر ڈوگرا نے بچے کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ اس کو فوراً ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔ مقبول پیارے بیٹے، بے حد شکریہ، اب تمھیں اپنے گھر چلے جانا چاہیے کیوں کہ تمھاری والدہ تمھارے لیے پریشان ہوں گی"۔

میں ہندوستان کا بیٹا، مقبول بٹ ہوں۔ یہ سب میرے بھائی ہیں اور یہ میری زمین ہے۔ یہیں میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا۔ میرے والد کا خون اس زمین کی مٹی میں ملا ہے اور میری ماں کے آنسو اس زمین کی سینچائی کرتے ہیں جن سے ہماری فصل اگتی ہے میں اپنے بھائیوں کا وفادار ہوں۔ اس زمین سے میرا خون کا رشتہ ہے۔ ہمیں اسی زمین سے روٹی ملتی ہے"۔

بچہ جو بہت دیر سے کھڑا تھا اچانک لڑکھڑایا اور زمین پر گر گیا۔

"ارے مقبول، تم ٹھیک تو ہو نا؟ کیا بیٹا تم زخمی ہو؟"

معمولی سی چوٹ ہے۔ سر، دشمن کی گولی میرے پیر میں لگ گئی تھی۔ زخم سے خون بہہ کر زمین پر آ گیا تھا۔ جہاں خون گرا تھا وہ مٹی لال ہو گئی تھی۔ بچے نے زخم سے خون کو بہتے ہوئے بڑے تعجب سے دیکھا۔

میرے والد کا خون بھی اس مٹی میں مل گیا تھا اور اب میرا خون بھی اس مٹی میں مل گیا ہے۔ میرے والدین اگر مجھ پر فخر کریں گے تو حق بہ جانب ہوں گے۔

کمانڈنگ افسر نے گرے ہوئے بچے کو زمین سے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں لے لیا اور ایمبولینس تک لے گیا اور اس نے

بہت آرام سے بچے کو اسٹریچر پر لٹادیا۔

بچہ درد اور تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ میجر ڈوگرا اس کے قریب گئے اور اس کو آرام دہ پوزیشن میں لٹادیا۔

"کیا بچہ بری طرح زخمی ہے!" کمانڈنگ افسر نے بے حد پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

مقبول مسکرایا، "ایک سپاہی ہرگز نہیں روتا، سر"۔

ایک اور آواز کہیں دور سے آئی جو وقت کی گرد میں کہیں کھو گئی۔ "ایک سپاہی ہرگز دشمن سے ڈر کر نہیں بھاگتا۔ بابا، آپ نے مجھ سے یہی کہا تھا نہ۔ وہ گولیوں کا مقابلہ کرتا ہے چاہے اس کا سینہ ہی چھلنی کیوں نہ ہو جائے"۔

یس ، بیٹا۔ ایک سپاہی کو نہیں رونا چاہیے۔ لیکن ایک باپ کا دل تو خون کے آنسو روتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران مجھے اپنے بیٹے کے لیے پی۔ وی۔ سی ملا تھا"۔

"وہ بہت بہادر رہا ہو گا۔ آپ بھی تو بیحد بہادر ہیں۔ پرواہ نہ کریں، میں بہت جلد ٹھیک ہو جاؤں گا۔ آخر میں ایک سپاہی کا بیٹا ہوں اور بڑے ہو کر میں بھی ایک سپاہی بنوں گا"۔

تم پہلے ہی ایک بہادر سپاہی ہو، بیٹا ہمیں تم پر فخر ہے اور مجھے امید ہے ایک دن تم ہماری فوج کی ایسی حوصلے اور بہادری سے رہنمائی کرو گے جیسا کہ تم نے آج کر دکھایا ہے"۔

انوکھی دیوالی

تنھی تاوورا

الوک نے چنما کو ناریل چھیلتے ہوئے دیکھا۔ چنما اپنا کام ختم کرنے کے بعد ہمیشہ چھوٹا سا ناریل اس کو دیا کرتی تھی۔ لیکن آج چنما زور زور سے رو رہی تھی۔

تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنی ساڑی کے پلّو سے اپنی آنکھیں پونچھ لیتی تھی۔

"چنما، تم کیوں رو رہی ہو؟" الوک نے معلوم کیا۔

"کچھ نہیں بابا، کوئی بات نہیں" گھستے ہوئے ناریل کی پلیٹ کو ہٹانے کے لیے کھڑی ہوتی ہوئی چنما نے جواب دیا۔

"کیا تم مجھے کھانے کو تھوڑا ناریل نہیں دو گی"؟ الوک بے چینی سے بولا۔

"ہاں کیوں نہیں، میں بھول گئی۔ کچھ ٹکڑے اس کے منہ میں ٹھونستی ہوئی وہ بے جان ہنسی ہنس دی۔

ممی کے آنے پر ہی چنما نے اپنے رونے کا سبب بیان کیا۔

"آتش بازی کے کارخانے میں دھماکہ ہوا ہے جہاں پر میرے بچے کام کرتے ہیں، اماں۔ سات بچے مر گئے ہیں......"
وہ اب سسکیاں لے رہی تھی۔ میرا بیٹا تو کسی نہ کسی طرح باہر نکل گیا، لیکن میری چھوٹی بچی......"

الوک اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ یہ اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ اس نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اسی طرح اس نے روتی ہوئی آواز میں سنا...... "وہ بچ گئی تھی لیکن اس کے ہاتھ بری طرح جل گئے تھے"۔

"وہ ایک پٹاخہ کو پیک کر رہی تھی، تبھی وہ بم اسکے ہاتھوں ہی میں پھٹ گیا"۔

الوک کو جان کر بہت راحت ملی۔ کم از کم وہ تو نہیں ہوا جس کا اس کو ڈر تھا۔ وہ مری نہیں تھی!

وہ چمنا کی بیٹی کو جانتا تھا۔ پچھلے سال تک، ہر اتوار کو وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا کرتی تھی۔

لیکن جب گرمیوں میں چمنا اپنے گاؤں گئی۔ وہ بغیر اپنی بیٹی کے ہی واپس آئی تھی۔ اسے یاد آیا کہ ممی نے اس کو کافی برا بھلا کہا تھا۔ "تم نے اس کی پڑھائی کیوں بند کرا دی اور اس کو وہیں چھوڑ آئی"؟

چمنا نے جواب دیا۔ "اماں، ہمیں اپنا قرض واپس کرنا ہے اور مکان کی مرمت بھی ہونا ہے۔ کارخانے سے اچھے پیسے کما لیتی ہے۔ گاؤں کے اور بھی بہت سے بچے وہاں کام کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا بھائی بھی وہاں کام کرتا ہے جو اس کی دیکھ بھال کرتا رہے گا"۔

ممی کو چمنا پر بہت غصہ تھا اور اب لڑکی اس حادثہ میں زخمی ہو گئی تھی۔

"اب وہ کہاں ہے"؟ ممی نے پوچھا۔

اسپتال میں، ڈاکٹر نے کہا ہے اس کے علاج کے لیے بہت مہنگی دواؤں کی ضرورت ہوگی۔ الوک نے سوچا، اسے اس کی مدد کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہیے۔ ممی نے کچھ روپے چمنا کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ اچانک اس کو ایک خیال آیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف دوڑا اور ایک پرانے بٹوے کے اندر کچھ تلاش کرنے لگا جو کہ اس کے پاپا نے اسے دیا تھا۔ اس کی انگلیوں میں ایک سو روپے کا نوٹ آ گیا۔ پاپا نے اسے دیوالی کے پٹاخے خریدنے کے لیے دیا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور پھر تیزی سے نیچے بھاگ گیا اور سو کے نوٹ کو چمنا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "یہ لو" اس نے کہا۔ "تمھاری بیٹی کی دواؤں کے لیے"۔

چمنا کا دل بھر آیا۔ وہ ان پیسوں کو نہیں لے گی جب تک کہ الوک کی ماں اسے پیسا لینے کے لیے مجبور نہ کرے گی۔ جب وہ چلی گئی۔ ممی نے الوک کو بہت پیار کیا اور کہا۔ "ڈارلنگ تم نے بڑا نیک کام کیا"۔

میرے پاس ممی صرف سو روپے تھے، جو اس کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ کاش میں اسے زیادہ پیسے دے سکتا۔ الوک نے بہت افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں بالکل" اس کی ماں نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اپنا سر ہلایا"۔ زیادہ پیسا نکالنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ خیر کوئی بات نہیں، ہم جو کچھ کر سکتے تھے ہم نے کیا"۔

الوک مطمئن نہیں تھا۔ غریب چمنا کی آہ و زاری اسے تکلیف دے رہی تھی۔

اسی شام پارک میں تمام بچے چیتنا کی بیٹی کے حادثہ کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ ان سب کو چیتنا پر بہت افسوس تھا۔ وہ سب اس کو بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ کافی سالوں سے ان کی کالونی میں کام کر رہی تھی اور زیادہ تر بچے اسے اپنے بچپن ہی سے جانتے تھے۔ سب بچوں کو چیتنا کے لیے پریشان ہوتا دیکھ کر الوک کو اچانک ایک آئیڈیا آگیا کہ وہ سب بچے اس کے لیے کیا کر سکتے تھے۔

"سنو، اس نے سب کو مخاطب کیا، کیوں نہ ہم اپنے تمام پیسے اکٹھا کر لیں جو ہمارے والدین ہمیں پٹاخے خریدنے کے لیے دیتے ہیں اور یہ سب رقم ہم چیتنا کو اس کی بیٹی کے علاج کے لیے دے دیں۔ میں تو پہلے ہی اپنی پٹاخے خریدنے کی رقم اس کو دے چکا ہوں، لیکن وہ کافی نہیں تھی"۔

اس کا آئیڈیا سن کر سب بچے خاموش ہو گئے۔

تمہارا مطلب ہے، پٹاخے خریدنے کے بجائے ہم اپنے پیسے اس کو دیدیں"؟ دیپا نے کسی قدر شکی لہجے میں کہا۔

"بالکل" الوک نے کہا۔

"لیکن پٹاخوں کے بغیر دیوالی کا کیا مزہ"؟ دیپک نے اعتراض کیا۔

"ہم کس طرح مزہ لے سکیں گے جب کہ وہ بے چاری بچی اسپتال میں پڑی ہوگی۔ اس کے علاوہ دیوالی میں پٹاخوں کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے"۔ الوک نے جواب دیا۔

بھئی واہ۔ کیا آئیڈیا ہے، دیپک نے طنزیہ انداز میں کہا۔

دیپک مذاق مت بناؤ، روشن نے سختی سے کہا۔ میرے خیال میں الوک کا آئیڈیا بہت عمدہ ہے۔

ہر بچہ خاموش ہو گیا۔ ان سب میں روشن سب سے بڑا تھا۔ عام طور پر بچے وہی کرتے تھے جو روشن کہہ دیا کرتا تھا۔

"بہر حال" روشن نے بحث جاری رکھتے ہوئے کہا۔ چیتنا کی بیٹی کے ساتھ جو حادثہ ہوا اس کے لیے تھوڑا بہت ہم بھی ذمہ دار ہیں"۔

"وہ کیسے؟" جیوتی نے پریشانی ظاہر کی۔

"اس کو اس طرح دیکھو"۔ روشن نے وضاحت کی، اگر کوئی بھی پٹاخے نہ خریدے تو پٹاخے بنانے والے کارخانوں کی ضرورت بھی نہ رہے گی اور اس طرح کسی کے بھی جل جانے کا امکان بھی نہیں رہے گا۔

"لیکن مجھے پٹاخے بہت اچھے لگتے ہیں"۔ چراگ نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

اس کے علاوہ ذرا سوچو چیتنا نے کتنی مرتبہ ماضی میں ہماری مدد کی ہے، روشن زور دیتے ہوئے بولا۔

"بالکل ٹھیک" چراگ نے مانا پچھلے سال جب ممی کا آپریشن ہوا تھا، وہ ہمارے ساتھ ہی رہی تھی۔

اور ایک مرتبہ، اسکول کے راستے میں ایک پاگل کتّے نے مجھے دوڑا دیا تھا۔ اس نے اپنی پرواہ نہیں کی۔ وہ مجھے اس درندے سے بچانے کے لیے دوڑ پڑی تھی۔ ہ۔ بپانے یاد کیا۔

کیا ہم اس کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟ صرف چند پٹاخوں کی قربانی دے دیں؟ الوک نے جذباتی ہو کر کہا۔ کیوں کہ اس نے محسوس کیا کہ ہر ایک کا دل پسیج رہا تھا۔

ہاں اور کیا۔ پٹاخوں سے فائدہ بھی کیا ہے سوائے اس کے کہ ہوا کو آلودہ کرنا اور بیحد شور تمام راستے تک گندے ہو جاتے ہیں"۔ جیوتی نے رائے دی۔ وہ اس پلان کے حق میں ایک اور وجہ سے بھی تھی۔ دراصل وہ پٹاخوں سے بیحد ڈرتی تھی۔

"جل جانے اور زخمی ہو جانے کا تو ذکر ہی کیا"۔ روشن نے اضافہ کیا۔

"تو پھر فیصلہ ہو گیا، الوک نے زور سے کہا۔ ہم کل اپنے سارے پیسے لائیں گے اور چنما کو دے دیں گے۔

دیپک کے علاوہ ہر کوئی اس پلان پر راضی تھا جس کی سمجھ سے باہر تھا کہ پٹاخوں کے بغیر کس طرح دیوالی منائی جا سکتی ہے۔ سب نے اس کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا اور سب کے سب بہت خوش اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

اگلی شام جب چنما اپنے گھر جاتے ہوئے پارک کے پاس سے گزری بچوں نے اس کو پکارا۔ روشن نے اس کے پاس جا کر اس کو وہ رقم دے دی جو ان سب نے جمع کی تھی کل رقم تقریباً دو ہزار روپیہ تھی۔ "چنما ان روپیوں کو اپنی بیٹی کے علاج کے لیے رکھ لو"۔

ہم سب نے یہ روپے تمہارے لیے جمع کیے ہیں"۔ اس نے کہا۔

چنما نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ "نہیں بابا، بالکل نہیں، میں تم بچوں سے کس طرح یہ رقم لے سکتی ہوں"۔ وہ بیحد خوفزدہ لہجے میں بولی۔ بچوں کے بہت اصرار کرنے پر بھی وہ راضی نہ ہوئی۔

بالآخر یہ کام الوک کی ممی پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ چنما کو یہ روپے لینے کے لیے راضی کر لیں۔

اس نے آنکھوں میں آنسو بھرے ایک بار ان سب کی طرف دیکھا اور پیسے لے لیے۔ "خدا تم پر اپنی رحمت نازل کرے"۔ اس نے بمشکل کہا اور تیزی سے اپنے گھر کے لیے چل دی۔

اگلے کچھ دن مصروفیت میں تیزی سے کٹ گئے۔ دیوالی کی تیاری زور شور سے جاری تھی، گھر کی صفائی، مٹھائی بنانا، چاول کے آٹے سے فرش کو سجانا یعنی رنگولی وغیرہ۔

......اور پھر دیوالی آ ہی گئی۔ تہوار منانے کے لیے تمام فیملی پارک میں جمع ہو گئیں۔ بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے۔ کہ جو کچھ انھوں نے چنما کے لیے کیا تھا۔ ان بچوں کے پپاؤں نے ایک دلچسپ شام کا اہتمام کیا تھا۔ ایک جادو کا تماشا بھی ہونا تھا۔ جس کا بچوں کو بے صبری سے انتظار تھا۔

SHOW

وہ سب شو کے شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ تبھی جیوتی چلائی۔ ارے دیکھو چمنا اپنی بیٹی کو بھی لائی ہے۔

ہاں واقعی، دیکھو وہ اپنی ماں چمنا کی ساڑی کے پیچھے چھپ رہی ہے۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹی بچی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھوں پر پٹیاں بندھی تھیں لیکن وہ جان دار مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔

تمام بچے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ "اب وہ کیسی ہے"؟

"اب وہ بہت بہتر ہے"۔ چمنا نے جواب دیا۔ "اس کی اسپتال سے چھٹی ہو گئی ہے"۔

بچو، یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا، بیحد شکریہ!"

اچانک، دیپک کو بچی کے پاس آتا دیکھ کر سب بچے اچنبھے میں رہ گئے اس نے بچی کو خوبصورت نئی گڑیا لا کر دی۔

"دیپک، یہ سب کیا ہے؟" روشن نے سوال کیا۔ ہمارا تو خیال تھا کہ تم پٹاخے پھوڑنے میں مصروف ہو گے"۔

"نہیں میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ صرف انھیں سے کھیلنے میں تو مزہ نہیں ہے"۔

دیپک جھینپتے ہوئے بولا۔

چمنا کی بیٹی کو اس کی نئی گڑیا بیحد پسند آئی۔ یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ اس شام کی سب سے زیادہ تابناک چیز کیا تھی، چمنا کے چہرے میں نظر آنے والی خوشی، بچوں کے چمکدار چہرے یا ان کے والدین کی آنکھوں سے جھانکتا ہوا فخر۔ لیکن ایک بات تو یقینی تھی جیسا کہ بعد میں جادوگر نے کہا "اس پوری دہلی میں ایک بھی کالونی ایسی نہیں ہے جو اس دیوالی سے زیادہ روشن ہو"۔

اُلٹا جادو

سونالی بھاٹیا

دیوالی کی چھٹیوں کا پہلا دن تھا۔ ملویکا باغ میں اپنی بلی کے بچے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ وہ آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ ملویکا ہمیشہ تلاش کرتی تھی کیوں کہ بلی اچھی طرح چھپنے کی ماہر تھی لیکن اگر ملویکا چھپ جاتی تو وہ اسے تلاش نہیں کر سکتی تھی۔ ملویکا کو اس کی زرا بھی پرواہ نہ ہوتی کہ سارے کھیل میں اسے ایک بار بھی چھپنے کا موقع نہ ملتا۔ باغ میں یہ سوچ کر گھومنے میں بڑا مزہ آتا تھا کہ اگر میں چھوٹی بلی ہوتی تو میں اپنے آپ کو کہاں کہاں چھپاتی؟

بلی کو ڈھونڈتی ہوئی وہ ایک جھاڑی کے نیچے رینگ گئی۔ اچانک پتوں کے ایک ڈھیر کے نیچے سے اسے بلی کی دم دکھائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں پہنچ گئی اور دُم پکڑ لی اور زور سے چلائی۔ "مل گئی مل گئی"۔

ملویکا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے ایک ہلکی سی آواز سنائی دی پلیز، چھوٹی بچی، مجھے چھوڑ دو۔

جب اس نے اپنا ہاتھ باہر نکالا، جس کو وہ دُم سمجھ رہی تھی در حقیقت ایک چھوٹی سی پری کا چھوٹا سا پاؤں تھا۔

ملویکا حیران کھڑی رہ گئی۔ اس کی حیرانی کی انتہا اس حد تک تھی کہ وہ بیچاری پری کو سیدھا پکڑنا بھی بھول گئی۔ وہ اس کا پاؤں پکڑے ہوئے تھی۔ وہ الٹی لٹک رہی تھی اور ملویکا اس کو حیران کن نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔

اس کے ہاتھ میں ایک براؤن بالوں والی چھوٹی سی بچی تھی جو اس کی سب سے چھوٹی گڑیا کے برابر تھی۔ لڑکی کی کالی آنکھیں، چھوٹی چپٹی ناک اور ننھے سے کان تھے۔ سب سے زیادہ حیران کن اس پری کے چاندی کی طرح چمکتے گلابی رنگ کے بازو تھے جو بالکل بڑی چمکتی ہوئی مکھی کے پروں سے جیسے تھے۔ اپنے داہنے ہاتھ میں جادو کی چھڑی لیے تھی جو دھنک کمان کے تمام رنگوں سے منور تھی۔

کافی دیر کے بعد ملویکا کو اس کی آواز سمجھ میں آئی۔ "کیا تم...... کیا تم واقعی پری ہو"؟ وہ تعجب بھرے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ اور اب کیوں کہ تم نے مجھے پالیا ہے میں تمہاری تین خواہشیں پوری کروں گی۔ کیوں کہ یہی ہمارا قاعدہ ہے"۔ پری نے جواب دیا۔

تین خواہشیں! یعنی میں تم سے کسی چیز کی بھی فرمائش کر سکتی ہوں، جو میں چاہوں؟ ملویکا نے معلوم کیا۔

بالکل ٹھیک، ملویکا، لیکن تم مجھے الٹا پکڑے ہوئے ہو، اور اس لیے جادو بھی الٹا ہی کام کرے گا"۔ پری نے جواب دیا۔

"الٹا؟ ملویکا واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ "پری یہ الٹا جادو کیا ہوتا ہے"۔

پری نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ دیکھو ملویکا جب تم کسی چیز کی خواہش کرتی ہو تو تمھیں بالکل اس کے مخالف سوچنا چاہیے اور اس طرح تمہیں وہ مل جائے گا، جس کی دراصل تمہاری خواہش تھی۔ اگر تم جو چاہتی ہو، اسی کی آرزو کرو گی تو اس کا الٹا ہو جائے گا۔ اسی کو الٹا جادو کہتے ہیں۔ جو تم کہو گی۔ اس کا مخالف تمہیں ملے گا، سمجھ گئیں۔

اس کے ساتھ ہی پری غائب ہو گئی۔

ملویکا تھوڑی دیر کے لیے جھاڑیوں میں رہی، دراصل وہ اس قدر حیران تھی کہ وہاں سے جا ہی نہ سکی۔ ایک ہلکی سی "میاؤں" کی آواز نے اسے چونکا دیا اور وہ باہر نکل آئی۔ بلی اس سے اپنے آپ کو رگڑ رہی تھی اور "میاؤں، میاؤں" کر رہی تھی کیوں کہ وہ کھیل کو جاری رکھنا چاہتی تھی۔

ملویکا نے جوش میں بلی کو اٹھا لیا، اوہ بلی آج تو ایک حیرت ناک واقعہ ہو گیا ہے! میری ملاقات ایک پری سے ہوئی ہے! تمہیں معلوم ہے اس نے مجھ سے میری تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا ہے، جو بھی میں چاہوں اس کے بارے میں میں اوانی کو بتاؤں گی۔ بلی ابھی تک اس کی گود میں تھی گھبرائی ہوئی لڑکی باغ کے دوسرے کونے کی طرف دوڑی جہاں اس کے پڑوسی اوانی کے باغ کی دیوار تھی۔

"اوانی، روانی!" ملویکا زور سے چلائی، یہاں آؤ، میرے پاس تمہارے واسطے ایک زبردست خبر ہے!"

اوانی دوڑتی ہوئی آ پہنچی اس سے پہلے کہ ملویکا اپنی کہانی سنانا شروع کرتی وہ الٹا ملویکا سے پوچھنے لگی، "اے ملویکا، گیس کرو کیا! میری نانی ماں کل ہمارے گھر آرہی ہیں اور ممی نے مجھے اِدلی بنانے کی اجازت، ان کے ناشتہ کے لیے دے دی ہے۔

نانی ماں، کو اِدلی بیحد پسند ہے اور میں اِدلی بنانا سیکھ رہی ہوں تا کہ وہ مزیدار اور نرم بن سکے۔ اب میں نانی ماں کے لیے بناؤں گی...... ہے نا کتنے مزے کی بات؟

اوانی، یہ ایک نا قابل یقین بات ہے، میری خواہش ہے کہ تمہاری اِدلی"

ملویکا بولتے بولتے رک گئی، لیکن وہ یہ الفاظ کہہ چکی تھی...... کہ میری خواہش ہے کہ...... الٹے جادو نے اپنا کام کر دکھایا۔ اس کو تو الٹا بولنا تھا، اپنی خواہش اگر وہ چاہتی تھی کہ اوانی کو تیار اِدلی مل جائے۔ "اوہ، ڈیر اس نے ابھی تک اوانی کو الٹے جادو کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے افسوس کیا اور ہلکی آواز میں بولی۔

"میں چاہتی ہوں کہ تمہاری اِدلیاں بدمزہ اور پتھر کی طرح سخت ہوں"۔

اوانی کو بیحد تکلیف ہوئی۔ ملویکا اس کی سب سے اچھی دوست تھی اور وہ اوانی کی اِدلیوں کے بارے میں ایسا سوچ رہی ہے کہ وہ خراب ہو جائیں۔ اوانی تکلیف سے رونے لگی، اپنے گھر بھاگ گئی۔ اس سے پہلے کہ ملویکا اسے سب کچھ بتا دیتی۔

ملویکا کو بہت غم ہوا وہ اپنی بلی سے بولی۔ "آؤ بلی"۔ اب دیکھو اوانی مجھ سے خفا ہو گئی ہے۔ وہ شاید مجھے اس کا موقعہ بھی نہ دے گی کہ میں اسے بتا سکوں۔ میری سب سے اچھی دوست سے میری لڑائی ہو گئی۔ کیوں کہ میں پری سے ملی تھی"

لیکن وہ یہ سوچ کر خوش ہو گئی کہ کم از کم اوانی کی نانی جی کو تو کھانے کے لیے مزیدار اِدلیاں مل جائیں گی۔ اس طرح اوانی بہت خوش ہو گی۔

اس خیال نے اس کو کافی سکون دیا۔ ملویکا اپنی ممی اور اپنے چھوٹے بھائی کو یہ سب سنانے کے لیے واپس اپنے گھر چلی گئی۔ وہ کنال کو اپنی صبح کی پری سے ملاقات اور الٹے جادو کے بارے میں بتانا چاہتی تھی۔

کنال باغ میں ایک بڑے سرخ اور ہرے رنگ کے غبارے سے کھیل رہا تھا جو تتلی کی مانند تھا۔ اس نے اس غبارے کو

ایک فینسی ڈریس مقابلے میں جیتا تھااور اسے اس بات پر بیحد فخر تھا۔

کنال اوپر کی طرف غبارے کو دیکھنے میں اتنا مگن تھا کہ اس نے یہ محسوس بھی نہ کیا کہ وہ کدھر جارہا تھا۔ وہ ایک پھولوں کے گملے سے جاٹکرایا۔ وہ گر گیااور غبارے کی ڈوری اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ ایک ہوا کا جھونکا غبارے کو اس سے کافی دور اڑا لے گیا۔ بے چارہ کنال زور زور سے رونے لگا۔ اس کی ممی اس کو پیار کرنے کے لیے گھر باہر دوڑی چلی آئی۔

ملویکاجو دور سے یہ سب دیکھ رہی تھی جانتی تھی کہ اب اسے کیا کرنا پڑے گا۔

وہ اپنی تین خواہشوں میں سے ایک اور کا استعمال کرے گی، لیکن یہ خواہش الٹی ہونی چاہیے اور اس کے بارے میں اس نے ابھی تک ممی کو بھی نہیں بتایا تھا وہ پہلے ہی اپنی ایک خواہش استعمال کر چکی تھی اور اب اسے دوسری کا استعمال کرنا تھا اس سے پہلے کہ وہ اس بارے میں کسی کو بھی کچھ بتائے۔ بہر حال اس میں کچھ کیا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ کنال کا غبارہ ابھی بھی نظر آرہا تھا اور اگر اس کو غبارے کو واپس لانے کے لیے جادو کا استعمال کرنا ہے، تو اسے فوراً ہی کرنا پڑے گا اس سے پہلے کہ غبارہ غائب ہو جائے۔

اس نے خواہش کی "میری خواہش ہے کہ یہ غبارہ کبھی بھی واپس نہ آئے"۔

اچانک ہوا کے رخ میں بدلاؤ آگیا۔ غبارہ جو کہ آسمان میں چھوٹا سا دھبا بن گیا تھا اب کافی بڑا نظر آنے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ملویکا، کنال اور ان کی ممی تتلی کی شکل والا، سرخ اور ہرے رنگ کا غبارہ دیکھ رہے تھے ملویکا کی خواہش کے صرف دو منٹ بعد ہی غبارہ آرام سے کنال کی گود میں آچکا تھا اور وہ خوشی سے غبارے کو پیار کر رہا تھا۔ الٹا جادو حیرت ناک طور پر کامیاب رہا تھا۔

لیکن ملویکا کی ممی اس سے بہت زیادہ ناراض تھیں۔ ملویکا تمہیں شرم آنی چاہیے"۔ وہ چلائیں، مجھے معلوم ہے تم فینسی ڈریس مقابلے میں کوئی انعام حاصل نہ کر سکیں لیکن تمہیں کنال سے اس طرح جلنا نہیں چاہیے۔ ذرا سوچو اگر وہ اپنا پیارا انعام کھو بیٹھتا تو میں تمہیں ذراسی بھی پیاسم نہ دیتی جو میں نے آج صبح بنائی ہے۔

ملویکا کی ممی نے کنال کو اٹھایا اور گھر کے اندر تیزی سے چلی گئیں۔ بے چاری ملویکا اپنی بات بتاتی ہی رہ گئی۔

ملویکا کو بہت افسوس ہوا۔ اس کی دو قیمتی خواہشیں ختم ہو چکی تھیں۔ ادانی ناخوش ہو گئی تھی اور ادھر ممی بے حد غصہ۔

وہ گل مُہر کے درخت کے سائے میں بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا چہرہ بلی کے نرم نرم بالوں میں چھپالیا اور بہت دیر تک روتی رہی۔ "اوہ بلی مجھے کیا کرنا چاہیے "! وہ روتی ہوئی بولی۔

بلی نے میاؤں کیا اور اپنی چھوٹی سی گلابی زبان سے اسے چاٹنے کی کوشش کی۔

اچانک ملویکا کو ایک آئیڈیا آیا۔ اس مصیبت سے نکلنے کا واحد طریقہ۔ تیسری خواہش کا استعمال کرنا تھا۔ وہ یہ خواہش کر سکتی تھی کہ اس کی ممی اور اوانی اس کو حقیقت بتانے کا موقع دیں۔ لیکن یہ ایک الٹی خواہش ہوتی۔ جو سراسر خواہش کا نقصان تھا۔ اور یہ اس کی آخری خواہش بھی ہوتی اور اس نے تو اس خوبصورت گڑیا کی بھی خواہش نہیں کی تھی جو اس نے کھلونوں کی دوکان پر دیکھی تھی۔ یا دھر نگوں کا سیٹ جن کو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اوانی کے پاس اسی طرح کے تھے۔ اس کا کوئی اور جواب تھا ہی نہیں۔

ملویکا نے خواہش کی۔ "میں خواہش کرتی ہوں کہ ممی اور اوانی مجھ سے ناراض ہی رہیں اور مجھے کبھی حقیقت بتانے کا موقع نہ دیں"۔

تبھی، اس نے زور کی آواز سنی۔ اس کی ممی اس کو گھر میں بلا رہی تھیں۔ وہ بے چینی سے گھر کی طرف دوڑی۔

اس کی ممی کے ہاتھ میں ٹیلی فون ریسیور تھا، "اوانی کی ممی تم سے بات کرنا چاہتی ہیں"۔

ملویکا، حنا آنٹی ٹیلی فون پر بول رہی تھیں۔ "اوانی نے مجھے بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے تمہارا وہ مطلب ہر گز نہیں تھا جو کچھ تم نے کہا تھا۔ کیا تم اسی وقت گھر آسکتی ہو اور اپڈلی بنانے میں ہماری مدد کرو گی"؟

"کیوں نہیں، میں ضرور آؤں گی، حنا آنٹی، ملویکا نے خوشی سے جواب دیا۔ "میں ان کو اصل حقیقت بتادوں گی"۔

اس نے ریسیور رکھا اور اپنی ممی کی طرف دیکھا جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ جادو پوری طرح چل گیا تھا۔ اب ممی اس سے بالکل ناراض نہیں تھیں۔

"کیا تم اوانی کے گھر جا رہی ہو، بیٹا؟" ممی نے پوچھا۔

"ہاں، ممی لیکن اس سے پہلے میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں"۔ ملویکا نے صبح کا سارا ماجرا اپنی ممی اور کنال کو سنا دیا۔ ممی، میں ہر گز کنال سے جل نہیں رہی تھی بلکہ میں اسی کے واسطے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی۔"

"خیر کوئی بات نہیں، مجھے افسوس ہے میں تم سے ناراض ہوئی۔ لیکن تم بھی محسوس کرو کہ اس وقت مجھے ایسا کیوں لگا"۔ ممی نے اس کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "اب تم اوانی کے گھر جاؤ اور اسے بھی ساری بات بتادو"۔

اس نے اوانی کو حقیقت بتائی۔ وہ بہت خوش تھی کہ اس کی اِدلیاں جادو بھری ہوں گی۔ شکریہ! ملویکا تم نے میرے لیے اپنی ایک خواہش استعمال کی۔ اوانی خوشی سے بولی

"مجھے افسوس ہے میں تم سے ناحق ہی ناراض ہوئی۔"

اوانی بہترین جادوئی اِدلیوں کو پاکر بے حد خوش تھی۔ اس نے اپنا پینٹ سیٹ بھی ملویکا کو تحفہ میں دے دیا اور ممی بھی اس سے بے حد خوش تھیں کہ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کے لیے اپنی خواہش استعمال کی اور یہ کہ اس کے لیے انھوں نے اسے خوبصورت گڑیا خرید کر دی۔

اب ملویکا کا صرف یہی کہنا ہے کہ اگر آپ کو کوئی پری مل جائے تو اسے کبھی بھی الٹا نہ پکڑنا۔
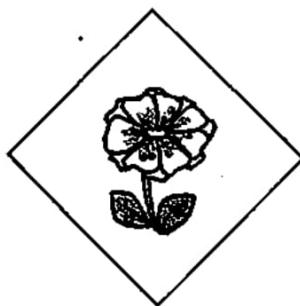
پورے سال پھولوں کے ساتھ

برندا گل

جنوری کے آغاز میں، ٹھنڈے اور نیلے رنگ کے آسمان کے نیچے ہمارا کالے پیلے رنگ والا اسکوٹر شانتی پتھ کے چوراہے کے ارد گرد گھوم رہا تھا جو دیکھنے میں ایک بڑی مدھو مکھی کی طرح لگ رہا تھا۔

"ایک بار پھر اس چوراہے کا چکر لو" میں نے پہلے ہی سے الجھے ہوئے ڈرائیور کو زور دے کر کہا۔ کیوں کہ پیڑوں سے نکلتی ہوئی خوشبو مجھے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔

"کیا مطلب"۔ ڈرائیور نے حیرانی سے کہا۔

اچانک ایسا لگا کہ جیسے اسکوٹر نے ڈرائیور کی بات کا جواب دیتے ہوئے اپنے آپ کو سڑک سے اوپر اٹھا لیا۔ آہستہ آہستہ مدھو مکھی نما اسکوٹر، سیدھا بہار کے اس پیڑ کی طرف اڑنے لگا جہاں سے دار چینی جیسی خوشبو والے پھولوں سے میٹھی مہک آ رہی تھی۔ اسکوٹر کے اچانک اوپر اٹھ جانے سے حیران و پریشان ڈرائیور پیچھے لڑھک گیا۔ لیکن میں اپنے آپ کو سنبھالے رہی اور پھر میں نے دہلی شہر کو مدھو مکھی کی آنکھوں سے دیکھا۔

مدھو مکھی نے ان چھوٹے چھوٹے پھولوں سے وہ رس چوسا جو کہ جھاڑیوں کے اندھیرے میں منہ چھپائے پڑے

تھے۔ "مزہ آگیا"۔ اس نے کہا اور پھر پاس کے مہاویر پارک میں گھس گیا۔

میرے لیے یہ پہاڑی ان خوبصورت جنگلات اور قدرتی میدانوں کی یادگار ہے جن کا ذکر ہماری مذہبی کہانیوں میں ہے، ایک مناسب جگہ بچھڑے ہوئے عاشقوں کے لیے جہاں پر ایک نازک خوبصورت لڑکی اپنے محبوب سے ملنے ایک طوفانی رات کو آتی ہے یا پھر جہاں پر شری کرشن اپنی بانسری بجاتے تھے...... یاسمین کے پھولوں کی خوشبو مدہوش کرنے والی تھی۔

مجھے ان جنگلی علاقوں سے بے حد پیار ہے، اور ان پیڑوں کی خوبصورتی سے جو یوں تو مہینوں خاموش کھڑے رہتے ہیں اور پھر اچانک بہار میں پھولوں سے لد جاتے ہیں"۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد مدھو مکھی پھر اڑ گئی۔ "ہر نیا مہینہ اپنے ساتھ نئے اور الگ قسم کے پھولوں کو لاتا ہے۔ فروری میں مغل گارڈن میں سب سے اچھے ہوتے ہیں"۔ وہ خوشی سے بھن بھناتی ہوئی ایک خوش رنگ ڈیلیا پر جا بیٹھی اور وہ پھر سیدھی گولائی والے پول کی طرف اڑی، جس کے چاروں طرف خوش رنگ پھول تھے، جہاں پر اور مدھو مکھیاں اور بھنورے پھولوں کا رس پی رہے تھے۔

"یہاں پر اس قدر بہار ہے کہ بلاوجہ کی بحث کون کرے"؟ اس نے مدہوش ہو کر کہا۔

"یہ باغات صدر کے محل کی خوبصورتی کو دوبالا کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ یہاں کے مالی انگریزی زمانے کو یاد کرتے ہیں۔ یہاں اس قدر خوبصورتی بکھری پڑی ہے جہاں سے اپنی پسند کے مطابق لطف اٹھایا جا سکتا ہے"۔

اور پھر دھولا کنواں کی مصروف سڑک کو پار کرتے ہوئے وہ کینٹ کی پر سکوت شاہراہ کی طرف بڑھ گئی۔ مدھو مکھی سنبھل کے پیڑ پر جا بیٹھی جو پھولوں، کوؤں، میناؤں، چڑیوں اور بلبلوں سے لدا ہوا تھا۔ "نئی دہلی میں سنبھل کے پیڑ ملنا مشکل ہے"۔ اس نے کہا اور ایک بڑے لال رنگ کے پھول میں چھپ گئی۔ "اگلے مہینہ، سنبھل کی کلیاں پھوٹیں گی۔ پرانے دنوں میں سنبھل کی روئی کے تکیے بنتے تھے"۔

سنبھل کے پیڑ پر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ بوہی نیا کے پیڑ کی طرف بڑھی جس پر بینگنی، گہرے گلابی اور سفید رنگ کے پھول کھلے تھے۔ اونٹ کے پیر نما پتے ہوا میں اڑ رہے تھے۔

کچھ گھونٹ پینے کے بعد مدھو مکھی اچانک پیڑوں کے جھنڈ سے ہوتی ہوئی اپنی ناک سے خوشبو کھینچتی ہوئی آم کے پیڑ

پر پہنچی جہاں پر مَول کھل رہا تھا۔ "اگر مَول سے آنے والے پھول کا اندازہ ہوتا ہے تو آنے والی گرمیوں میں تو مزہ ہی آجائے گا"۔ اس نے خوشی سے کہا۔

تب تک ہوا گرم اور خشک ہو چلی تھی۔ "ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے اپریل کے مہینے کو ضرور کچھ سوچ سمجھ کر ہی سخت مہینہ کہا ہوگا، مگر میرے خیال میں انھوں نے اپریل کے مہینہ میں کبھی دہلی کی بہار نہ دیکھی ہوگی۔ "وہ دیکھو"......اس نے بوگن ولیا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس کے رنگ برنگے پھول سے جن گھروں کو رونق بخش رہے تھے، اور جکروندے کا پیڑ جس پر نیلے نازک پھول کھل رہے تھے۔

"ابھی ان موسموں کا مزہ ہی پوری طرح نہیں مل پاتا کہ گل مُہر کھل اٹھتا ہے"۔ وہ بھن بھناتے ہوئے بولی۔

"اور پھر لابر نم کے کھل جانے کا وقت آجاتا ہے، جس پر سنہرے اور پیلے رنگ کے پھول اپنے بوجھ سے اس کی ٹہنیوں کو جھکا دیتے ہیں۔ اور اس ماہ میرا وزن بڑھ جاتا ہے"۔ اس نے رس چوستے ہوئے کہا۔

جون کی گرمی اپنے عروج پر تھی اور تھکا رہی تھی۔ مدھو مکھی نے کہا کہ ایسے موسم میں آرام کی سب سے اچھی جگہ چھوٹے جرول پیڑوں کی چھاؤں میں ہے۔ ہم مرکزی دہلی سے اڑے جہاں، سر لیوٹن نے سڑکیں بننے سے پہلے ان کے دونوں طرف پیڑ لگوائے تھے۔ یہ بات مدھو مکھی کو اس کے دادا نے بتائی تھی۔

ہم نہرو پارک میں اترے۔ طرح طرح کے پھولوں نے تپش سے کچھ راحت دی۔ مدھو مکھی آم کے پیڑ کی طرف اڑ چلی جہاں پھلوں کا رس ٹپک رہا تھا۔ یہی زندگی ہے، وہ محسوس کرے گی اور خدا کا شکر، ان نعمتوں کے لیے کرے گی۔

مانسون کے پہلے بادلوں نے آسمان کو ڈھک لیا تھا۔ یہ مدھو مکھی کو ہمایوں کے مقبرے میں لے جانے کے لیے کافی تھا۔ "مغل گارڈن کا مزہ کچھ اور ہے جہاں پر جیومیٹریکل نقش و نگار پر باغات بنائے گئے ہیں۔ شہر کی مصروفیت سے الگ بارشوں کی دوپہر مجھے نیم، املی اور مولسری کے پیڑوں پر گزارنا بہت اچھا لگتا ہے"۔

وہ کہتی گئی کہ کبھی کبھار اتوار کے روز وہ یونی ورسٹی کے ہرے بھرے علاقے کی طرف اڑ جاتی ہے جہاں پر کیکر کے بیچ مزدور کھڑے ہوتے ہیں۔ اصل میں اس کا مطلب کارونیشن گراؤنڈ کی مورتیوں سے تھا۔ پیلے رنگ کے کیکر کے جھنڈوں کی خوشبو اور بارش کے پانی سے بھیگی مٹی کی خوشبو مدہوش کرنے والی تھی مدھو مکھی نے کہا۔

اس کے بعد مانسون کے دنوں میں مدھو مکھی اولینڈر کے پیلے پیڑوں میں بارش سے ہوئی سردی میں خود کو محفوظ

کرتی ہے جس کے پھول کالے گہرے بادلوں میں سر اٹھائے کھلتے نظر آتے ہیں۔ یہ پھول دہلی ڈیولپمنٹ کے بنائے گئے مکانوں میں بے تحاشا نظر آتے ہیں جب کہ پاس ہی کھڑے کیسیس اور گل مُہر کے پیڑ خاموش چپ سادھے رہتے ہیں۔ ان مکانوں کے رہنے والے اپنی کیاریوں میں چاندنی مدھومتی، چمپا اور موگرا کے پیڑوں کا اپنے آپ اضافہ کر لیتے ہیں۔

مدھو مکھی بے حد خوش تھی۔ شہر جان بوجھ کر چھوٹے پھولوں کے پیڑوں سے بھر دیا گیا تھا اور یہ نظارہ اپارٹمنٹ کے ہر بلاک سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہاں چاہتے ہوئے بھی برگد کا درخت نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ میں چھوٹے پیڑوں کی مخالف نہیں ہوں لیکن جب میں پھولوں کو چوس رہی ہوتی ہوں، وہاں بچوں کے آجانے سے سارا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے۔ ان پیڑوں پر وہ چڑھ تو نہیں سکتے۔ اس سے زیادہ ایک بچے کے لیے خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ وہ برگد کی اونچی ٹہنیوں سے جھولا جھولیں۔ جب میں جوان تھی......

"چلو پرانے پیڑ کی طرف چلیں، جو عام طور پر مارچ کے مہینے میں کھلتا ہے لیکن میں اکثر اکتوبر میں، جب یہ دوبارہ کھلتا ہے، جاتی ہوں"۔

وہ ایک خوب صورت پیڑ تھا جس کے تکونے پھول تھے۔ لال اور بھورے رنگ کی کلیاں لگی تھیں اسی میں دن آرام سے گزر گیا۔

جیسمین کی مدہوش کرنے والی خوشبو سے سردیوں میں سویرے سویرے مدھو مکھی زرا سست ہو جاتی، مگر سویرے کے دوسرے پہر تک اس کی تیزی واپس آجاتی۔

"ہمیں جلد بازی نہیں کرنا چاہیے"۔ ایک صبح اس نے کہا اس نے سنا تھا کہ کودسیا پر بہار ہے۔

ہم سائیرس کے پیڑ کے پاس سے گزرے جس کی سنہری پیلی پھلیاں سورج کی روشنی میں جگمگا رہی تھیں۔ چلتی ہوئی ہوا سے ہلتی ہوئی وہ ایسے لگ رہی تھیں کہ جیسے ایک دوسرے کو صدیوں پرانا راز بتا رہی ہوں، مدھو مکھی نے ایسا سوچا۔

کامراج مارگ کے چوراہے سے اڑتی ہوئی وہ سیدھی کودسیا کی طرف پہنچی سفید گلابی رنگ کے پھولوں سے لدا ہوا پیڑ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پھولوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد وہ ان پر ٹوٹ پڑی۔ میرے کہنے کے باوجود وہ اپنی حد سے زیادہ پی رہی تھی اور تب تک چپتی رہی جب تک گر نہیں گئی۔ چکر لگاتے لگاتے وہ گرم ہو گئی اور آسمان پر چکر لگاتے لگاتے

اچانک وہ غائب ہو گئی۔ پھر ہم تیزی سے نیچے کی طرف آگئے۔ ٹھیک شانتی پتھ کے چوراہے پر۔

مدھو مکھی زمین پر آرام سے اتر گئی۔ ایک مدھو مکھی کی طرح نہیں، مگر ایک ٹی ایس اسکوٹر کی طرح۔ وہاں کوئی اور نہیں، اسکوٹر کا ڈرائیور کھڑا تھا۔

"تم کہاں تھیں" وہ چلایا۔

"وقت اور فضا کے سفر پر"۔ میں نے مدہوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے پیٹرول کی ٹنکی میں جھانکا جس میں خوشبودار تیل پڑا تھا! پھر اس نے میٹر کی طرف دیکھا۔ جہاں پر چونکا دینے والی رقم تھی۔ میں حیران رہ گئی۔ اب مسکرانے کی اس کی باری تھی۔ اس نے خوشی سے کہا "خیالوں کا سفر سستا نہیں ہوتا"۔

اس نے اپنی گاڑی کو تھپتھپاتے ہوئے کہا "تم تو مدھو مکھی کی طرح مصروف ہو گئیں"۔

اسکوٹر طرح طرح کی آوازیں نکالتا اور جھٹکے کھاتا ہوا چل پڑا اور گاڑیوں سے بچتے بچاتے اور جام ہوئی سڑکوں کو چیرتے ہوئے ہم چلتے رہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ خوبصورت سفر ایک خواب تھا۔ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے مجھے ایک کورسیا کا پھول بغل میں پڑا ہوا ملا۔